

وَأَنْ تَقُومُوا لِلَّيْتَامَى بِالْقِسْطِ

یتیموں کی اوریتھ کلمہ سلسلہ

ایک سی اور فتویٰ جلد



وَأَنَّ تَقْوَمُ وَاللَّيْتَامَى بِالْقِسْطِ

تیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ

ایک علمی اور فقہی جائزہ

حافظ احمد یار

ناشران و تاجران کُتب
اردو بازار لاہور

الفیصل

۲۹۷۳۳۳

۷۲۹۸

۵۵۲۹۰

۲

ISBN 969-503-129-3

باہتمام مجلس فاضلین علوم اسلامیہ

نومبر 1999ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی

قیمت - 75/- روپے

فہرست عنوانات

۲	ابتدائیہ
۴	مقدمہ طبع اول
۷	مقدمہ
۱۰	تمہید
حصہ اول	
باب اول	
۲۷	قرآن کے احکام وراثت
باب دوم	
۲۳	اسباب میراث
باب سوم	
۲۷	حجاب
باب چہارم	
۳۸	وارثوں کے طبقات
۳۸	فصل اول: ازروئے فقہ حنفی
۴۱	فصل دوم: ازروئے فقہ جعفری
۴۳	فصل سوم: شعیہ سنی کی رو سے پوتے کے متعلق
باب پنجم	
۵۲	مقام حیرت

۶۰

خاموشی کیوں؟

حصہ دوم

۶۸

مسئلہ کا جدید پہلو

باب اول

۶۹

پس منظر

باب دوم

۷۶

اجتہاد نو

۷۶

فصل اول : پہلی دلیل

۸۳

فصل دوم : اصول قائم مقامی پر بحث

۹۱

فصل سوم : متجددین کے بقایا دلائل

باب سوم

۹۹

قرآن اور تحفظ مصاحح یتامی

باب چہارم

۱۰۸

قانون وصیت کی ضرورت

باب پنجم

۱۱۵ اسلامی قانون وراثت میں ترمیم کے امکانات

۱۲۲

ضمیمہ الف

۱۲۸

ضمیمہ ب

۱۳۰

ضمیمہ ج

۱۶۸

مراجع و مصادر

ابتدائیہ

” یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ “ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب لاہور، کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اشاعت سے قبل استاذ الاساتذہ حافظ احمد یار صاحب نے اس میں ضمیمہ ”ج“ کا اضافہ کیا تاکہ موضوع سے متعلق اس وقت تک کی تازہ ترین معلومات کو شامل کیا جاسکے۔ محترم حافظ صاحب نے میری درخواست پر مسودہ کی پروف ریڈنگ ایسا بظاہر معمولی لیکن صبر آزما کام بھی کیا۔ علمی حلقوں میں کتاب کو پذیرائی ملی۔ لہذا موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن اہل علم کے استفادہ کے لیے محترم حافظ صاحب کی یاد میں ایک علمی نشست کے انعقاد کے موقع پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ کریم ہماری اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر جمیلہ شوکت

ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و شرعیہ

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مقدمہ طبع اول

ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں ابتداء ہی یعنی ۱۹۵۱ء سے علمی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ الحمد للہ ان چالیس سال کی علمی کاوشوں کا ثمرہ تقریباً آٹھ سو علمی و تحقیقی مقالات کی شکل میں ادارے کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ مقالات ایم اے کی سطح پر منتخب طلبہ و طالبات کے رسعات قلم کا نتیجہ ہیں جو قرآن حکیم، حدیث نبوی، فقہ، تاریخ، تقابل ادیان، سائنس و فلسفہ، تہذیب و ثقافت نیز اسلام کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی افکار کے علاوہ دیگر متنوع عصری مسائل سے متعلق ہیں۔

الحمد للہ اس گرانقدر علمی ذخیرے سے استفادے کے لئے ملک بھر کی جامعات کے مختلف شعبہ جات سے طلبہ و طالبات اور اہل علم ادارہ علوم اسلامیہ کی لائبریری تشریف لاتے ہیں۔

ان میں بیشتر مقالات نہ صرف معیاری ہیں بلکہ بعض اہم عصری مسائل سے بھی متعلق ہیں۔ اہل علم حضرات اور ادارے کے خیر خواہوں کی خواہش رہی کہ ہم ایسے مقالات جو اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے معیاری اور اہم ہیں ان کے اشاعت کا اہتمام کریں تاکہ علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے اصحاب فکر و نظر اور طلبہ کے لئے براہ راست اور بسہولت استفادہ ممکن ہو سکے۔ ۱۹۸۸ء میں ادارہ علوم اسلامیہ کے زیر اہتمام سیرت کانفرنس کے موقع پر جناب پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد ڈائریکٹر ساؤتھ ایشین سٹڈیز سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب بحیثیت مہمان خصوصی تشریف لائے۔ انہوں نے ان مقالات کا جائزہ لے کر باصرار فرمایا کہ اہم مقالات کی طباعت کا انتظام ہونا

چاہیے، اہل علم کی اس خواہش اور ترغیب ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم نے چند اہل علم حضرات سے درخواست کی کہ وہ اس ذخیرے سے چند مقالات کا انتخاب کریں ان حضرات نے مقالات کے اس معتدبہ ذخیرے کا جائزہ لینے کے بعد پہلے مرحلے پر چند مقالات کو اشاعت کے لئے تجویز فرمایا جن میں سرفہرست حافظ احمد یار کا مقالہ ” یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ تھا۔“ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اہم مسئلہ فنڈز کا حصول تھا۔ جس میں ہم اس وقت کامیاب نہ ہو سکے لہذا یہ منصوبہ معرض التواء میں پڑ گیا۔

۱۹۹۲ء کی تعطیلات گرما کے دوران بعض ضروری وسائل فراہم ہونے تو اس کار خیر کا آغاز حافظ صاحب محترم کے مقالے ہی سے کرنے کا فیصلہ ہوا۔

استاد محترم جناب حافظ احمد یار اہل علم کے درمیان معروف ہیں۔ ان کا شمار ادارے کے ” السابقون الاولون “ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ادارے میں ۱۸ سال تک تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیئے اور کچھ عرصہ اس کی سربراہی کے مشکل کام کو بھی سرانجام دیا۔ حافظ صاحب کے پسندیدہ مضامین قرآن حکیم، فقہ اور جغرافیہ ہیں۔ آج کل آپ قرآن حکیم کے چار مباحث یعنی لغت، اعراب، رسم اور ضبط پر مشتمل ایک کتاب کی تالیف میں مشغول ہیں۔ یہ مباحث ماہنامہ ” حکمت قرآن “ لاہور میں جنوری ۱۹۸۹ء سے بااقتساط چھپ رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور وہ دین و علم کی خدمت میں اسی طرح مصروف و مشغول رہیں۔

حافظ صاحب نے ” یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ “ پر اپنا مقالہ ایم اے ۱۹۵۶ء کے امتحان کی جزوی تکمیل کے لئے پیش کیا۔ یہ مقالہ بغیر کسی حذف و اضافے کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اور یہ امر حافظ صاحب کی زمانہ

طالب علمی میں ہی علمی و دینی استعداد پر دلالت کرتا ہے۔ اس موضوع پر بعد میں جو کچھ منظر عام پر آیا اسے حافظ صاحب نے ”ضمیمہ ج“ میں دینی و علمی دلائل کے ساتھ نہ صرف پیش کیا بلکہ اس پر محاکمہ بھی کیا ہے۔

ان شاء اللہ یہ مختصر کتاب دینی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہو گا۔ اہل علم حضرات اور بالخصوص عدالتوں اور دیگر قانون ساز اداروں کے لئے راہنما ثابت ہو گی۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت

ادارہ علوم اسلامیہ

جامعہ پنجاب، لاہور

مقدمہ

۱۹۵۱ء کے موسم گرما کا ذکر ہے، تحصیلدار علاقہ کا ہمارے گاؤں میں کیمپ تھا۔ مجھے بھی چند کھیتوں کی حد بر آری کے سلسلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ نواحی دیہات سے ”انتقالات اراضی“ کے متعلق بہت سے لوگ بلائے گئے تھے۔ ازاجملہ دو ایسے آدمی بھی ہوتے تھے جو اپنی زندگی ہی میں اپنے یتیم پوتوں کے نام حصہ زمین منتقل کرانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان انتقالات کی تصدیق وغیرہ کے بعد بر سبیل تذکرہ تحصیلدار صاحب نے فرمایا:

”دیکھئے تو یہ کیسے مسلمان ہیں جو احکام الہی کی اطاعت سے منحرف ہونے کے لئے حیلے ڈھنڈتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن پوتوں کو محروم الارث رکھا ہے یہ ان کے نام جائدادیں منتقل کر کے نافرمانی کو نیکی سمجھ رہے ہیں۔“

یتیم سے فطری ہمدردی، اسلام کے دین حق اور دین فطرت ہونے پر ایمان اور تحصیلدار صاحب کا یہ تعجب خیز تبصرہ --- یہ تھے وہ متصادم محرکات جنہوں نے مجھے اسی دن سے اس مسئلہ کی پوری پوری تحقیقات کے لئے بے چین کئے رکھا۔ تا آنکہ میں نے اسے اپنے مقالہ کا موضوع بنایا۔

اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ایم اے میں داخلہ لینے کے بعد ہی میں نے اپنے محترم صدر شعبہ علامہ علاؤالدین صاحب صدیقی مدظلہ کے سامنے اپنی اس طلب تحقیق کا اظہار کیا تو انہوں نے نہ صرف میرے اس ارادہ و جذبہ کی حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ اپنے عالمانہ مشوروں، مفید ہدایات اور مسلسل ہمدردانہ رہنمائی سے میری محنت میں ایک ذوق پیدا کر دیا۔ حتیٰ کہ یہ مقالہ انہیں کی ہدایت و نگرانی میں اتمام کو پہنچا۔

خصوصاً اس ضمن میں ان کے ذریعے سے مجھے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامی کی مختصر مگر بے نظیر لائبریری سے جو گراں بہا مدد ملی ہے اس کا ذکر نہ کرنا ادائے فرض میں کوتاہی کے مترادف ہو گا۔ عام مروجہ مستند کتابوں کے علاوہ دینی و اسلامی علوم پر جدید ترین عربی، فارسی، انگریزی اور اردو لٹریچر، اس لائبریری کی ایسی خصوصیت ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ مجموعہ ان علوم کے ایک جدید (Modern) متعلم کے لئے یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

دسمبر ۱۹۵۲ء میں جب کہ میں اس مقالہ کی ترتیب و تہذیب میں مصروف تھا۔ پنجاب اسمبلی میں یہی مسئلہ زیر بحث آکر وقت کا خاصہ ”سنسنی خیز“ مسئلہ بن گیا۔ اس بناء پر مقالہ کو مکمل ترین (Up-to-Date) صورت میں دینے کے لئے مجھے بعض جگہ مناسب اضافے بھی کرنے پڑے۔۔۔ لیکن اس ضمن میں اخبارات اور مجالس میں بحث و مباحثہ کا جو سلسلہ چلا اس نے اس افسوسناک حقیقت کا انکشاف کیا کہ عوام تو درکنار ہمارے اہل علم حضرات بھی اسلامی قانون وراثت سے عموماً بے خبر ہی ہیں۔ اور اس پر حضرت صادق مصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ حدیث بے اختیار یاد آتی ہے کہ ”انہ اول

علم ينزع من امتى -

بہر حال آئندہ صفحات میں ” یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ “ کو محض جذباتی اور مناظرانہ نقطہ نظر سے نہیں بلکہ علمی اور فقہی طریق پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور پڑھنے والوں سے بھی یہی جذبہ اور یہی نقطہ نظر متوقع ہے۔

واللہ ولی التوفیق وهو یهدى الی سبیل الرشاد

حافظ احمد یار

متعلم ایم۔ اے

رول نمبر ۵۶۵ (۱۹۵۴ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تہہید :

(ملکیت ، جائداد اور وراثت کے مسائل تمدن انسانی کے لوازمات میں سے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمدن و حضارت کے مختلف درجات اور الگ الگ اثرات نے ان مسائل کے متعلق بھی متعدد نظریات اور تصورات پیدا کر دیئے ہیں (۱)۔

(۱) اسلام میں --- جو انسان کے روحانی و مادی ارتقاء و تعالیٰ کے لئے خود انسان کے خالق و مالک کا تجویز کردہ دستور العمل ہے --- دوسرے تمدنی و معاشرتی مسائل کی طرح قانون وراثت کو بھی اس خوبی ، جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے کہ جہاں ایک طرف وہ دوران دولت کے بہترین اصولوں پر مبنی ہونے کے باعث ایک نہایت معتدل و متوازن اقتصادی نظام قائم کرتا ہے ۔ وہاں وہ قریب قریب ہر قسم کے رشتہ داروں کے دعاوی وراثت کو اپنے اپنے موقع و محل پر زیر نظر رکھ کر ایک ایسے معاشرہ تیار کرنا چاہتا ہے جس کے افراد باہمی خیر خواہی اور نفع رسانی کی بنا پر ایک مضبوط رشتے میں مربوط ہو جائیں ۔

یہی وجہ ہے کہ علم الفرائض (اسلامی قانون وراثت) اسلام میں ایک نہایت اہم مقام رکھتا ہے ۔ خود قرآن حکیم نے فرائض کے جادی نہ کرنے پر سخت عذاب سے ڈرایا ہے ۔ چنانچہ سورہ ”النساء“ میں آیات میراث کے بعد ارشاد ہوتا ہے ۔

ومن یعص الله و رسوله و يتعد حدوده يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين (۲) ” اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا

اور اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرے گا تو اللہ اسے آگ میں ڈالے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن سزا ہوگی۔“

چونکہ احکام وراثت کا تعلق براہ راست روز مرہ کی عملی زندگی کے نہایت اہم پہلو سے ہے۔ اس لئے نبی اکرم ﷺ نے بھی صحابہؓ کو اس علم کی طرف خصوصاً توجہ دلائی اور اسے دین کا نہایت ضروری جزء قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿۱﴾ تعلموا الفرائض فانہ من دینکم و انہ نصف العلم وانہ اول علم ینزع من امتی (۳) ”قانون وراثت کو سیکھو۔ کیونکہ یہ ہمارے دین (کی اہم ضرورت میں سے ہے۔ اور یہ آدھا علم (دین) ہے اور یہی علم سب سے پہلے میری امت میں سے اٹھا لیا جائے گا۔“

﴿۲﴾ تعلموا الفرائض و علموها الناس فانہ امر و مقبوض وان العلم سيقبض و تظهر الفتن حتی یختلف اثنان فی الفریضة فلا یجدان من یقضى فیہا (۴) ”علم وراثت کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ میں (آخر) مرنے والا ہوں۔ اور (پھر ایسا وقت بھی آنے والا ہے کہ علم اٹھا لیا جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے۔) اور حالت یہاں تک پہنچے گی) کہ دو آدمی وراثت کے متعلق جھگڑا کریں گے اور انہیں اس میں (صحیح شرعی طریقہ پر) فیصلہ دینے والا نہیں ملے گا۔“

اور بھی اس طرح کی احادیث ہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ آپؓ اکثر فرمایا کرتے تھے:

اذا تحدثتم لتحدثوا فی الفرائض و اذا لهوتم فالهوا فی الرمی (۵) ”جب باتیں کرو تو علم میراث کے متعلق کیا کرو۔ اور کھیلنا ہو تو تیر اندازی کی مشق کیا کرو۔“

صحابہ کرامؓ میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور پر اس علم کے ماہرین

میں شمار ہوتے تھے اور مسائل میراث کے متعلق اکثر روایات و احکام کا منبع و ماخذ یہی ہیں (۶)۔

۱۔ امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ ۲۔ حضرت عبداللہ بن ابن عباسؑ
۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۴۔ حضرت زید بن ثابتؓ ۵۔ ام المؤمنین
عائشہ صدیقہؓ۔

اگرچہ عہد صحابہؓ میں بھی متعدد نئے اور مشکل مسائل نمودار ہوئے
(مثلاً الجدمع الاخوة اور "عول" کے مسئلے) لیکن اسلامی سلطنت کی وسعت
اور ہر مذہب و ملت سے آنے والے نو مسلموں کی کثرت نے بے شمار نئے
نئے جزئی اشکالات اور پیچیدہ صورتیں پیدا کر دیں۔ مثلاً ایران کے مجوسی
محرمات ابدیہ سے شادی کر لیتے تھے۔ فرض کیجئے ایک مجوسی فیروز نے اپنی بیٹی
زرینہ سے شادی کر لی اور اس سے ایک لڑکی گلزار پیدا ہوئی۔ اب اگر یہ کنبہ
مسلمان ہو جائے تو یہ لڑکی گلزار زرینہ کے مرنے پر اس کے ترکہ سے بطور
دختر حصہ لے یا بطور بہن کے اور اسی طرح زرینہ گلزار کی ماں بھی ہے اور
بہن بھی۔ وغیرہ ذلک۔

چنانچہ زمانے کی ضروریات نے دیگر علوم شرعیہ کی طرح اس علم کی
تدوین پر بھی فقہاء کو متوجہ کیا۔ انہوں نے اسے فن کی حیثیت دی اس کے
لئے خاص زبان اور اصطلاحات وضع کیں اور اس کے ایک ایک شعبہ پر قرآن
و سنت کی روشنی میں غور و فکر کر کے تفصیلی و جزئی قواعد مستخرج کئے۔ پھر اس
علم کے مباحث محض فکری و نظری مباحث نہیں تھے بلکہ دنیا کی سب سے
بڑی سلطنت کے نافذ العمل قانون وراثت کی حیثیت سے قدم قدم پر ان قواعد
کے حسن قیام کو عملاً جانچا جا سکتا تھا۔

اس طرح یہ فن اپنے زمانے کے بہترین قانون دان دماغوں نے
پروان چڑھایا اور یہ انہی بزرگوں کی دیانتدارانہ مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج

ہمارے پاس اسلامی قانون وراثت کی پوری تفصیلات اور اس کے عہد بعہد پیدا ہونے والے اختلافات اور متنازعہ فیہ قانونی تشریحات و تعبیرات کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ نیز قانون وراثت کی تمام جزئیات تک کو اس تفصیل کے ساتھ منضبط کیا ہے کہ مسائل کے کسی گوشہ کو تشنہ تکمیل نہیں رہنے دیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے اجتہادی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں لیکن ان کی فنی خدمات کا بدترین دشمنوں تک کو اعتراف ہے۔ چنانچہ سراجیہ کا مشہور مترجم Sir William Jones لکھتا ہے:

" I am strongly disposed to believe that no possible question could occur on the Mohammeden Law of Succession which might not be rapidly and correctly answered".(7)

اور علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں Von Kremer کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"Next to the Romans, there is no other nation, besides the Arabs, which could call its own a system of law so carefully worked out --- and law of inheritance being a superemely original branch of it". (8)

اسلامی احکام و قوانین کی تشریح و تعبیر کے سلسلے میں جو مختلف مذاہب فکر پیدا ہوئے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) اہل السنہ والجماعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، ظاہری وغیرہ) (۲) شیعہ (اثنا عشریہ، اسماعیلیہ، زیدیہ وغیرہ)۔

ان میں سے جزوی اختلاف کے باوجود احناف کو اہل سنت کا اور اثناء عشریہ کو شیعہ کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر جہاں جہاں ہم مسئلہ زیر بحث کے متعلق اسلامی فرقوں کا نقطہ نظر پیش کریں گے تو وہاں انہیں دو گروہوں کو لیں گے۔

اب ہم اس مسئلہ پر اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلے حصے میں اس کا قدیم پہلو بلا تنقید یعنی اس بارے میں فقہاء کا مسلک و موقف پیش کریں گے اور اس مقصد کے لئے نیز مسئلہ کی حقیقت ذہن نشین کرنے کے لئے قرآن و حدیث اور فقہ کے ضروری احکام وراثت کو ذرا بالتفصیل بیان کریں گے۔۔۔۔ اور دوسرے حصے میں مسئلہ کا جدید پہلو یعنی قدیم مسلک پر اعتراضات، ان پر تنقید اور مسئلہ کا حل از روئے قرآن و سنت پیش کریں گے۔

واللہ ولی التوفیق والہدایۃ فی کل حال و عمل۔



حواشی اور حوالہ جات

- ۱- اس موضوع پر اضافہ معلومات کے لئے Encyclopedia of Religion and Ethics کی جلد ہفتم میں مضمون بعنوان "Inheritance" کا مطالعہ بے حد مفید اور دلچسپ بھی ہو گا۔
- ۲- النساء / ۱۴
- ۳-۳- الموارث الاسلامیہ صفحہ نمبر ۸ پر یہ احادیث احمد-ترمذی، حاکم اور ابن ماجہ کے حوالے سے درج ہیں اور بعینہ اسی حوالے سے مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی نے اپنے "رسالہ وراثت" کے شروع میں درج کی ہیں مجھے ترمذی دیکھنے کا اتفاق ہوا اس میں الفاظ کا تفاوت ہے۔ البتہ الجامع الصغیر سیوطی ۳/۲۵۴ اور تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۴۵۷ پر بھی یہ احادیث اسی طرح موجود ہیں۔
- ۵- الموارث الاسلامیہ صفحہ ۹
- ۶- الموارث الاسلامیہ صفحہ ۹ نیز سیرت عائشہ (سید سلیمان ندوی) صفحہ ۱۹۹
- 7- Mohammeden Law by F.B. Tyabji p.825
- 8- Reconstruction of Religious Thought in Islam p.168 & 170 ہے۔



پہلا حصہ

مسئلہ کا قدیم پہلو

باب اوّل

قرآن کے احکام وراثت

قرآن حکیم کے دوسرے بہت سے احکام کی طرح احکام میراث بھی ایک مناسب تدریج اور آہستگی کے ساتھ نازل کئے گئے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی تمام قوانین وراثت کو سورہ النساء کی چار پانچ آیات میں اس خوبی، اختصار و ایجاز اور جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ عقل انسانی اس اعجاز پر حیرت ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ان آیات کو آسانی فہم اور تسہیل حوالہ کے لئے ایک خاص تقسیم اور عنوان بندی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

الف۔ اصول وراثت

للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او كثر نصيبا مفروضا (۱)

ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں، 'تھوڑا ہو یا بہت' مردوں کا حصہ ہے اور (ایسا ہی) ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے (اور یہ) حصہ (ہمارا اپنا) ٹھرایا ہوا (ہے)۔

ب۔ اولاد کے متعلق احکام

يوصيكم الله في اولادكم للذكر مثل حظ الانثيين فان كن نساء فوق اثنتين فلهن ثلثا ما ترك. وان كانت واحدة فلها النصف (۲)

(مسلمانوں) تمہاری اولاد (کے حصوں) کے بارے میں اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ (دیا کرو) پھر اگر لڑکیاں (ہی ہوں اور وہ دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ترکہ میں ان کا حصہ دو تہائی اور اگر (صرف)

ایک لڑکی ہی ہو تو اسے (ترکہ کا) آدھا (حصہ ملے گا)۔

ج۔ والدین کے متعلق

ولابویہ لكل واحد منهما السدس مما ترك ان كان له ولد فان لم یكن له ولد و ورثه ابواه فلامه الثلث فان كان له اخوة فلامه السدس من بعد وصية یوصی بها او دین (۳)

اور میت کے ماں باپ کو (یعنی) دونوں میں سے ہر ایک کو ترکہ کا چھٹا حصہ (ملے گا) اس صورت میں کہ میت کی اولاد ہو اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے وارث (صرف) ماں باپ ہی (بن رہے) ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی ہو گا (اور باقی باپ کا) پھر اگر (اس صورت میں ماں باپ کے ساتھ) میت کے کچھ بھائی بہن بھی ہوں۔ تو ماں کا چھٹا حصہ ہو گا (اور باقی باپ کا لیکن یہ (وراثتیں) وصیت اور قرض کے پورا کرنے کے بعد (تقسیم کرنے کا حکم ہو گا)۔

د۔ زن و شوہر کے متعلق

ولکم نصف ما ترك ازواجکم ان لم یکن لهن ولد فان كان لهن ولد فلکم الربع مما تركن من بعد وصية یوصین بها او دین۔ ولهن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان كان لکم ولد فلهن الثمن مما ترکتم من بعد وصية توصون بها او دین (۴)

اور جو ترکہ تمہاری بیویاں چھوڑ مریں۔ اگر ان کے اولاد نہیں ہے تو اس میں تمہارا آدھا حصہ ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے ترکہ میں تمہارا چوتھائی حصہ (ہو گا) اور یہ (تقسیم بھی) وصیت و قرض کے پورا کرنے کے بعد (ہوگی) اور جو کچھ (ترکہ) تم چھوڑ مرو اور تمہاری کوئی اولاد نہ ہو تو تمہاری بیویوں کا حصہ ایک چوتھائی اور اگر تمہارے اولاد ہو تو تمہارے ترکہ میں سے

تمہاری بیویوں کو آٹھواں حصہ (ملے گا) اور یہ (تقسیم بھی) وصیت اور قرض کے پورا کرنے کے بعد (ہو گی)۔

۵- حقیقی یا علاقائی بہن بھائیوں کے متعلق

ان امرأهك ليس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترك و هو يرثها ان لم يكن لها ولد. فان كانتا اثنتين فلهما الثلثان مما ترك وان كانوا اخوة رجالا ونساء فللذكر مثل حظ الانثيين (۵)

اگر کوئی ایسا آدمی مر جائے جس کے اولاد نہ ہو (اور نہ ہی باپ دادا ہو اور ایسے آدمی کو کلالہ کہتے ہیں) اور اس کی صرف ایک ہی بہن ہو۔ تو اس (بہن) کو ترکے کا نصف دیا جائے گا) اور بہن مر جائے اور اس کے اولاد نہ ہو تو اس کے مال کا وارث بھائی ہو گا۔ پھر اگر بہنیں دو یا دو سے زیادہ ہوں۔ تو ان کو اس کے ترکہ میں سے دو تہائی (ملے گا) اور اگر بھائی بہن ملے جلے ہوں۔ تو مرد کو عورت سے دو گنا (کے اصول پر تقسیم ہو گی)

۶- اخیانی بہن بھائیوں کے متعلق

وان كان رجل يورث كلاله او امرأة وله اخ او اخت فلكل واحد منهما السدس فان كانوا اكثر من ذلك فهم شركاء في الثلث من بعد وصية يوصى بها او دين غير مضار (۶)

اور اگر وہ مرد کہ جس کی میراث ہے باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا یا (کوئی) عورت ہو ایسی ہی۔ اور اس میت کے ایک بھائی ہے یا بہن ہے تو دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔ پھر اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو سب حصہ دار ہوں گے ایک تہائی میں --- بعد اس وصیت کے جو ہو چکی ہے یا قرض کے - جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو۔

مختلف وارثوں کے حصوں کے تعین کے علاوہ ان آیات سے باا جمال

وراثت کے حسب ذیل اصول اور قواعد حاصل ہوتے ہیں (۷)۔

۱- وراثت کے حق دار صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہوں گی۔

۲- سب میراث دو ہوں گے۔

(الف) اولاد ہونا یعنی میت اپنے وارث کا باپ یا ماں ہو (الوالدان)

(ب) اقرب ہونا یعنی میت اپنے وارث کا زیادہ قریبی رشتہ دار ہو

(الاقربون)

۳- وراثت کا قانون ہر قسم کے املاک متروکہ پر جاری ہو گا۔

(مما ترك --- ممالک منہ او کثر)

۴- جب قرابت مساوی درجے کی ہو گی تو مرد کا حصہ عورت سے دوگنا

ہو گا۔ مثلاً بیٹا بیٹی خاوند بیوی، بھائی بہن دیکھئے آیات مندرجہ تحت

جزء (ب) و (د) و (ه)۔

۵- بعض وارثوں کو ہر حالت میں ترکہ کا صرف ایک "متعین حصہ" ملتا

ہے۔ مثلاً ماں، خاوند یا بیوی --- اور بعض وارثوں کو کبھی تو ترکہ

کا ایک مقررہ حصہ دیا جاتا ہے اور کبھی وہ "بقایا" کے مالک بن جاتے

ہیں مثلاً باپ بیٹی بیٹا، دیکھئے آیات مندرجہ جزء (ب) و (ج) و (د)

و (ه) (پہلی قسم یعنی متعین حصہ پانے والوں کو فقہ فرائض کی

اصطلاح میں "ذوی الفروض" کہتے ہیں اور دوسری قسم یعنی "بقایا" یا

بقایا میں دوسروں کے ساتھ شامل ہو کر حصہ پانے والوں کو اصطلاح

میں "عصبات" کہتے ہیں)۔

۶- بعض دفعہ ایک وارث ترکہ موجودگی کا دوسرے وارث کے حصہ پر اثر

پڑتا ہے دیکھئے آیات مندرجہ جزء (ج) و (د) --- اسے اصطلاح میں

"حجاب" کہتے ہیں اور ہمارے زیر بحث مسئلہ کا نمونہ یہی اصول ہے۔

۷- باپ کی موجودگی میں اس کی اولاد کو کوئی حصہ نہیں ملتا دیکھئے

جزء (ج) (۸)۔

۸- ماں باپ، خاوند اور بیوی کو ہر حال میں جائداد سے حصہ ملے گا۔
چاہے میت کی اولاد ہو یا نہ ہو۔ ولا بویہ لكل واحد منهما السدس
--- ولکم نصف ما ترک ازواجکم --- ولهن الربع مما
ترکتھن .

۹- ہر قسم کی وارثتیں وصیت اور قرض کے پورا کرنے کے بعد تقسیم
کرنے کا حکم جاری ہو گا۔

۱۰- کل متعین حصے چھ طرح کے ہو سکتے ہیں $1/8$ ، $1/4$ ، $1/2$ ، $1/3$ ،
 $2/3$ (۹)۔

بالاتفاق یہی وہ اصول ہیں (اور یہ بالکل ظاہر آیات سے سمجھے جاسکتے
ہیں) جن پر ہر مذہب فکر نے فقہ فرائض کی عمارت کھڑی کی ہے۔
اگرچہ ان قواعد کو بنیادی طور پر مان لینے کے باوجود ان کے اطلاق
اور تعبیر و توضیح میں اختلاف کی بنا پر مسائل میں بھی اختلاف ضرور
پیدا ہو گیا ہے۔

ان میں سے خصوصاً نمبر ۲ یعنی ”سبب وراثت“ اور نمبر ۶ یعنی ”قاعدہ
حجاب“ مسئلہ زیر بحث سے خاص طور پر متعلق ہیں اس لئے سب سے
پہلے ان کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے۔



حواشی اور حوالہ جات

- ۱- النساء/۷
 - ۲- ایضاً/۱۱
 - ۳- ایضاً/۱۱
 - ۴- النساء/۱۴
 - ۵- النساء/۱۷۶
 - ۶- النساء/۱۴
- مبنی بر مطالعہ مختلف تفاسیر قرآن خصوصاً احکام القرآن لابن العربی ۱/۱۳۶
 ببعد فتح القدير للشوکانی ۱/۳۹۳ ببعد و احکام القرآن للجصاص
 ۲/۷۰ و تفسیر بیان القرآن مولانا تھانوی ۲/۹۴ ببعد و تفسیر
 المراغی ۴/۱۹۹
- ۸- بلکہ شیعہ کے نزدیک صرف ماں بھی اپنی اولاد کے لئے حجاب ہو جاتی ہے دیکھئے
 تفسیر ابو الفتوح رازی ۳/۱۲۳ تحت تفسیر "فان كان له اخوة فلامه السدس"
 ان حصص کی حکمت و فلسفہ پر بحث کے لئے دیکھئے حجة الله البالغة اردو ترجمہ جلد
 دوم صفحہ ۵۱۶ تا ۵۱۹۔

باب دوم

اسباب میراث

مما ترك الوالدان کہہ کر قرآن حکیم نے وراثت کے سب سے بڑے فطری سبب کو بیان کر دیا ہے۔ یعنی مال چھوڑ کر مرنے والا جس کا باپ یا ماں ہے وہ سب سے پہلے وراثت کا حقدار ہے (ا) چاہے وہ مرد (بیٹا) ہو یا عورت (بیٹی) اس کے بعد والاقربون کہہ کہ یہ بھی بتا دیا کہ اگر مرنے والا بے اولاد ہو تو آخر کسی کا قریبی تو ہو گا پس اس کے پسماندگان میں سے جس کے ساتھ اس (میت) کا زیادہ قریبی رشتہ ہو وہی وارث ہو گا۔۔۔۔ گویا قرابت کے متعدد دعویداروں میں سے ترجیح کسے دی جائے؟ اس کی بھی نشان دہی فرمادی ہے اور اس "الاقربون" سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وراثت صرف "والدین" کی طرف سے ہی نہیں ملے گی بلکہ بعض دوسرے قریب ترین رشتہ داروں سے بھی ملے گی۔ مثلاً اولاد اور زوجین سے بھی جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

☆ اولاد کا حق مقدم تھا اور بظاہر ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کو وراثت میں سے حصہ نہیں ملنا چاہئے۔۔۔۔ لیکن قرآن حکیم نے حکم دیا کہ ماں، باپ، خاوند اور بیوی کو بہر حال اولاد کے ساتھ بھی حصہ دیا جائے گا اور اسی لئے یہ چھ یعنی ماں باپ، بیٹا، بیٹی، خاوند اور بیوی "اصلی وارث" کہلاتے ہیں۔ یہ سب وراثت لیتے ہیں اور ان سب کی طرف سے وراثت ملتی بھی ہے۔

☆ اب مزید غور کیجئے۔ اولاد کی موجودگی میں ماں باپ، خاوند اور بیوی

سب کا حصہ کم ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بنوۃ (اولاد ہونا) سبب میراث کی سب سے قوی جہت ہے۔

☆ پھر دیکھئے۔ اولاد کے بالکل ہی نہ ہونے کی صورت میں ”بقایا“ تمام حصے کا مالک باپ کو ٹھہرایا گیا ہے۔ دیکھئے آیت مندرجہ جزء (ج) (۲)۔۔۔۔۔ ماں، خاوند یا بیوی کو نہیں۔ بلکہ انہیں ایک مقررہ حصہ ہی ملتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ پہلی جہت (فرع یا اولاد) نہ ہونے کی صورت میں قابل ترجیح جہت ابوۃ (باپ ہونا) ہے۔

☆ اب پھر غور کیجئے جب نہ اصل موجود ہو نہ فرع (نہ اولاد نہ باپ جسے کالہ کہتے ہیں) تو بھائی بہن (اطراف) کو وراثت کا حقدار ٹھہرایا گیا (۳)۔۔۔۔۔ بیوی اور خاوند کو ان کے مقررہ حصوں سے زیادہ پھر بھی نہیں دیا گیا۔۔۔۔۔ معلوم ہوا کہ اسباب وراثت میں ”اطراف“ تیسری جہت ہیں۔ جو پہلی دونوں جہات کی عدم موجودگی میں قابل ترجیح ہوں گے۔

پس اسباب میراث دو ہوئے نکاح اور نسب۔۔۔۔۔ پہلی قسم کے وارث (یعنی زوجین) تو ہر حالت میں حصہ پاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور نسبی ورثاتی پھر تین قسمیں ہیں فرع۔ اصل اور اطراف۔ فرع اور اصل تو بیک وقت وارث ہوں گے اور ایک قسم کے نہ ہونے کی صورت میں دوسری قسم وارث بنے گی اور ان دونوں کی عدم موجودگی میں تیسری قسم (اطراف) وارث ہوگی۔

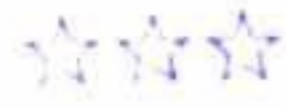
قرآن سے تو اسباب میراث یہی معلوم ہوتے ہیں۔ احادیث نبوی سے (ان تمام اقسام کی عدم موجودگی میں) ایک اور سبب میراث کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یعنی (ولایۃ العتاقہ) (۴) (آقا کا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث بننا جبکہ اس آزاد شدہ غلام کا اپنا کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہ ہو) اور یہی تین اسباب میراث بالاتفاق تمام مسلمانوں میں (۵) مسلم ہیں۔ یعنی نکاح اور نسب۔۔۔۔۔ اور غور کیجئے تو دراصل سبب میراث دو ہی بنتے ہیں یعنی نسب اور

سبب کیونکہ نکاح و ولاء ہر دو موخر الذکر میں آجاتے ہیں۔
 اسباب وراثت کے بیان کے بعد اب ان اسباب کا بیان کرنا بھی
 ضروری ہے جن کی وجہ سے اسلام میں کوئی شخص وراثت پانے سے محروم کر
 دیا جاتا ہے۔ لہذا اگلے باب میں اس سے بحث ہوگی۔



حواشی اور حوالہ جات

- ۱ تفسیر احمدی از ملا جیون صفحہ ۱۶۵ (یہ ملا جیون اورنگ زیب عالمگیر کے استاد تھے۔
- ۲ کتاب ہذا صفحہ ۱۳
- ۳ ایضاً صفحہ ۱۷ جزء (ہ) ۱۳
- ۴ مطابق حدیث الولاء لحمته كلمته النسب. بلوغ المرام صفحہ ۱۹۷ بحوالہ ابن حبان و حاکم۔
- ۵ خوارج کی فقہ بھی قریباً اہل سنت کے مطابق ہے۔ اسی لئے بعض فرقہ انگیز اہل سنت کا پانچواں مذہب بھی کہتے ہیں۔ (چار مشہور مذہب احناف، شوافع، مالک اور حنابلہ کے ہیں)۔ البتہ وہ ولایۃ العتاقہ کے قائل نہیں ہیں اور اسی جائیداد کو خیرات کر دینے کا حکم دیتے ہیں (Muslim Institutions p.141) اسی طرح شیعوں میں ولایۃ العتاقہ کی شرائط میں بھی باہم قدرے اختلاف ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے جامع الاحکام ۱/۵۲) یہ سید امیہ علی صاحب فی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اصل مؤلف مرحوم معتزلی تھے (۱۰۰)۔ مہیاچہ میں اس بات کا خود انہوں نے اعلان کیا ہے) اس لئے بعض مسائل میں ان کی آراء قابل مطالعہ ہیں۔



باب سوم

حجاب اور منع کے قواعد اور ان میں فرق

کسی شخص کے وراثت سے بالکل ہی محروم رہنے یا اس کے حصے میں کمی آ جانے کے دو باعث ہو سکتے ہیں منع یا حجاب۔ یہ دونوں لفظ متحد المعنی ہیں۔ یعنی دونوں کے معنی روک دینے کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً ان میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کو ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے (۱)۔

اصطلاح میں منع اسے کہتے ہیں کہ کسی شخص میں ”اسباب منع ارث“ میں سے کوئی سبب پایا جائے۔ ایسے شخص کو وراثت سے مطلقاً کچھ نہیں ملتا اور اسے ”ممنوع الارث“ کہتے ہیں۔ اسباب منع ارث حسب ذیل ہیں (۲)۔

☆ اختلاف دینین: یعنی مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ بوجہ حدیث لایرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم (۳) ایک مذہب کا غیر مسلم دوسرے مذہب کے غیر مسلم کا وارث ہو سکتا ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں گو مختلف فرقوں سے ہوں۔ لیکن تقسیم وراثت میں شخص متوفی کے مسلک کی رعایت کی جائے گی (۴)۔

☆ قتل: یعنی قاتل اپنے مقتول کا وارث نہیں بن سکتا اس کی بنیاد بھی حدیث ہے لیس للقاتل من المیراث شیء (۵) اس میں قتل کی نوعیت وغیرہ کے متعلق جزئی اختلاف موجود ہے (۶)۔

☆ الرق: یعنی غلام ہونا بموجب حدیث من باع عبدا له مال فماله للبتاع الا ان يشترط المبتاع (۷) کیونکہ غلام کو وارث بنانا دراصل اس کے مالک کو

وارث بنانا ہے۔

☆ اختلاف دارین یا حرابہ: یعنی دار السلام کا رہنے والا دار الحرب کے رہنے والے مسلمان کا نہ مورث بن سکتا ہے نہ وارث۔

پہلے تین اسباب مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔
صرف چوتھی وجہ میں اختلاف ہے (۸)۔

خیال رہے کہ ممنوع الارث کا وجود بھی قوانین وراثت کے لحاظ سے کالمعدوم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے کسی دوسرے حصے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ مثلاً اگر کسی آدمی کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہ کافر ہو (ماں باپ کے نو مسلم ہونے کی صورت میں مثلاً) یا اپنے باپ کو قتل کر دے تو اس آدمی کی بیوی (اس کافر یا قاتل کی ماں) کو اپنے خاوند کی جائیداد سے $1/4$ ہی ملے گا اور اس بیٹے کی وجہ سے $1/8$ نہیں ہو جائے گا اسی طرح اگر کوئی شخص مرنے کے بعد ایک غیر مسلم بیٹا اور ایک مسلم پوتا چھوڑ جائے تو بیٹا ممنوع الارث ہو گا اور اپنے باپ کے ہوتے ہوئے بھی پوتا کل جائیداد کا مالک ہو گا (۹)۔

حجاب: جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے لغت میں حجاب اور جب کے معنی بھی روکنے یا ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اسی لئے پردہ کو بھی حجاب کہتے ہیں۔ اور چوکیدار (گینڈ کیپر) کو بھی حاجب کہتے ہیں۔ خانہ کعبہ کی سدانت (متولی یا پروہت ہونا) کو ---- جو بنی قصبی کے ہاتھ میں تھی ---- بھی اسی لئے حجاب کہتے تھے کیونکہ اس کی حفاظت اور کنجیاں ان کے ہاتھوں میں تھی ---- لیکن اصطلاح شرعی میں ایک وارث کے دوسرے وارث کی موجودگی کی وجہ سے اپنے حصے سے بالکل محروم ہو جانے یا اس کے حصے میں کمی واقع ہونے کو حجاب یا حجاب بالشخص کہتے ہیں (۱۰) اور جس شخص کے حصے پر اثر پڑ رہا ہو اسے "محجوب الارث" کہتے ہیں۔

آیات و احادیث میں غور و فکر اور قرآن کے احکام وراثت کے تتبع و استقراء سے فقہاء نے حجاب بالخاص کو دو قاعدوں پر مبنی قرار دیا ہے (۱۱)۔

۱- تقدیم یا ”اولویت“: ---- یعنی بعض وارثوں کو دوسرے پر مقدم سمجھنا۔ یہ قاعدہ قرآن حکیم کی آیت واولو الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب اللہ (۱۲) سے اور آیات میراث کے مختلف احکام سے مستنبط ہوتا ہے (۱۳)۔ اور ویسے عقلاً بھی یہ بات بدیہی سی ہے کہ آخر سب وارث یکساں نہیں قرار دیئے جاسکتے۔

پھر یہ تقدیم علی الترتیب تین لحاظ سے کی جاتی ہے۔

(الف) تقدیم بالجھتہ: یعنی فرع (اولاد) کو اصل (باپ دادا) پر اور اصل کو اطراف (بھائی بہن) پر مقدم کیا جائے گا (۱۴)۔

(ب) تقدیم بالقرب: یعنی جب وارث جہت کے لحاظ سے برابر ہوں تو پھر ان میں سے جس شخص اور میت کے درمیان کم واسطے ہوں گے اسے ان اشخاص پر مقدم کیا جائے گا جن کے اور میت کے درمیان مقابلتاً زیادہ واسطے ہوں گے (۱۵)۔ اسی قاعدے کو مختصراً ”الاقرب فالاقرب“ کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اسی قاعدے کی رو سے بھائی کو بھتیجے پر اور بیٹے کو پوتے پر مقدم کیا جاتا ہے اور یہی قاعدہ ہماری ساری بحث کا مرکز ہے۔

(ج) تقدیم بالقوة: جب وارث جہت میں بھی برابر ہوں اور قرابت میں بھی یکساں ہوں تو قوی قرابت والے کو مقابلتاً کمزور قرابت والے پر ترجیح دی جائے گی۔ مثلاً اخ شقیق (حقیقی بھائی) کو اخ علاتی (صرف باپ کی طرف سے بھائی) پر مقدم کیا جائے گا۔

۲- حجاب بالخاص کا دوسرا قاعدہ ”ادلاء“ ہے اور وہ یہ ہے کہ جن دو آدمیوں کا باہمی رشتہ براہ راست نہیں بلکہ کسی اور درمیانی واسطے کے ذریعے

سے ہے تو یہ دونوں شخص اس درمیانی واسطے کی موجودگی (زندگی) میں ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔ اس قاعدہ کی اصل تو سورہ نساء کی آیت نمبر 11 ہے یعنی باپ کی موجودگی میں اس کی اولاد محبوب ہو جاتی ہے (۱۶)۔ البتہ فقہ فرائض کی تمام کتابوں میں اس قاعدے کا استثناء تسلیم کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخیافی بھائی یا بہن (صرف ماں کی طرف سے بھائی بہن) اپنی ماں کی موجودگی میں بھی حصہ پائیں گے (جس صورت میں وہ وارث بن سکتے ہوں تو) حالانکہ ان کا تعلق میت سے اسی ماں کے واسطے سے ہے۔ اور وجہ اس استثناء کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ باپ تو اپنی اولاد کو محبوب کر کے تمام حصہ خود پاتا ہے اور اس سے اس کی اولاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ اس کے مرنے پر یہ سب جائیداد انہیں کو ملے گی لیکن ماں چونکہ کسی صورت میں بھی ”بقایا“ تمام جائیداد کی مالک نہیں بنتی بلکہ اس کا حصہ $1/6$ یا $1/3$ ہی رہتا ہے لہذا اخیافی بھائیوں کا حصہ بھی نکالا جائے گا (۱۷)۔ اس استدلال کی قوت و ضعف سے قطع نظر (کیونکہ یہ موضوع بحث سے خارج ہے) صرف یہ استثناء یاد رکھنا چاہئے کیونکہ آگے چل کر اس کا ذکر آئے گا۔ (دیکھئے کتاب بذا) صفحہ ۱۱۳، ۱۱۵۔

حجاب کی اقسام:

جیسا کہ اصطلاحی تعریف سے بھی ظاہر ہے حجاب بالخاص دو طرح کا ہوتا ہے (۱۸)۔

۱- حجاب نقصان: جب کہ حصہ میں صرف کمی واقع ہو رہی ہو۔ اس قسم کا حجاب ہر قسم کے وارثوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور اس کی چھ مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) کبھی ایک مقررہ حصے کے بجائے دوسرا مقررہ حصہ ملتا ہے مثلاً اولاد

کی موجودگی میں خاوند کا $\frac{1}{2}$ سے $\frac{1}{4}$ بیوی کا $\frac{1}{4}$ سے $\frac{1}{8}$ اور ماں کا $\frac{1}{3}$ سے $\frac{1}{6}$ ہو جاتا ہے۔

(۲) کبھی بطور ذی فرض (مقررہ) حصہ پانے کی بجائے دوسروں کے ساتھ عصبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً بیٹی بیٹوں کے ساتھ۔

(۳) کبھی عصبہ (بقایا کا مالک یا بقایا میں شریک ہونے) کی بجائے بطور ذی فرض کے حصہ ملتا ہے۔ حالانکہ حصہ اس طرح پہلے کی نسبت کم ہو جاتا ہے مثلاً اولادِ نرینہ کی موجودگی میں میت کا باپ۔

(۴) کبھی حصہ منفرد ہونے کی بجائے دوسروں کے ساتھ مشترک ہونے کے باعث کمی ہو جاتی ہے مثلاً دو سے زیادہ بیٹیوں یا ایک سے زیادہ بیٹیوں کی صورت میں۔

(۵) یہی صورت عصبہ میں بھی ہو سکتی ہے مثلاً متعدد بیٹے ہوں تو۔

(۶) کبھی ذوی الفروض کے حصص کا مجموعہ اکائی سے بڑھ جاتا ہے جسے

اصطلاح میں ”عول“ کہتے ہیں اور پھر ایک تناسب سے سب کا حصہ گھٹایا جاتا ہے یا کسی خاص وارث کا مثلاً مسئلہ منبریہ میں۔ (۱۹)

کتب فقہ فرائض میں حجاب نقصان کی پوری تفصیلات دی ہوئی ہوتی ہیں (۲۰)۔ جن میں اس طرح کے حجاب کی تمام ممکن صورتوں کا استقصاء کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ہمارے مسئلے سے زیادہ متعلق نہیں ہے، لہذا ان سب کا بیان غیر ضروری ہے۔

۲- حجاب حرماں: جس صورت میں ایک وارث اپنے حصے سے بوجہ کسی

دوسرے وارث کی موجودگی کے بالکل ہی محروم ہو رہا ہو۔۔۔۔ اور دراصل صحیح اصطلاح میں ایسے ہی شخص کو ”محبوب الارث“ کہتے ہیں۔ اس قسم کے

حجاب کی اصل تو وہی دو قاعدے ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں (۲۱)۔ یعنی قاعدہ ”اولاء“ اور تقدیم بالقرب۔۔۔۔ لیکن فقہاء کے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے

لئے اس کی مزید توضیح بھی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ ہمارا موضوع بحث بھی یہی ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ چھ وارث ایسے ہیں جو شیعہ سنی کسی کے نزدیک بھی کسی صورت میں بھی ”محبوب الارث“ یعنی بالکل محروم نہیں ہو سکتے (۲۲) ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، خاوند اور زوجہ۔۔۔۔۔ کیونکہ ان کا تعلق میت سے براہ راست ہوتا ہے اور باقی تمام قسم کے وارث انہی اصلی وارثوں میں سے کسی نہ کسی کے ذریعے اور واسطے سے رشتہ رکھتے ہیں۔ اس واسطے کی موجودگی (زندگی) میں تو وہ ویسے وارث نہیں بن سکتے مثلاً باپ کی موجودگی میں باپ کا باپ (دادا) اور بیٹے کی موجودگی میں اس بیٹے کا بیٹا (پوتا) حصہ نہیں پا سکتے (۲۳)۔

اور اگر وہ درمیانی واسطے زندہ نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی

ہیں۔

(۱) یا تو بالواسطے رشتہ رکھنے والے تمام وارث برابر کے درجے کے ہوں گے یعنی میت اور ان تمام وارثوں کے درمیان یکساں واسطے ہوں گے۔ (اور اسے اصطلاح میں ”استواء قرابات“ کہتے ہیں) تو اس صورت میں سب وارث جائیداد میں حسب قواعد شرعی حصہ دار ہوں گے مثلاً صلبی اولاد کی عدم موجودگی میں اولاد کی اولاد کی طرح ورثہ کا (۲۴)۔ یعنی وہ اولاد کی قائم مقام سمجھی جائے گی (۲۵)۔

(۲) یا بالواسطے رشتہ رکھنے والوں میں درجوں کا تفاوت ہو گا۔ یعنی بعض کم واسطوں سے میت سے تعلق رکھتے ہوں گے اور بعض زیادہ واسطوں سے۔ اس صورت میں پہلی قسم کو (جسے اصطلاح میں اقرب کہتے ہیں) دوسری قسم (ابعد) پر مقدم کیا جائے گا (۲۶)۔

گذشتہ دو ابواب میں وراثت پانے یا وراثت سے محروم ہونے کے جو

اصول بیان ہوئے ہیں، ان کی بناء پر فقہاء و ائمہ نے سہولت فہم کی خاطر --- استحقاق وراثت کی ترتیب کے لحاظ سے ورثاء کو مختلف گروہوں، طبقوں یا درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ اگرچہ اس تقسیم طبقات میں باہم کچھ اختلاف ہے لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے جزوی اختلاف کے باوجود فقہ حنفی اور فقہ جعفری (اثنا عشریہ) کو باقی تمام مکاتب فقہ کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہذا اگلے باب میں مختصراً ہر دو فریق کی تقسیم طبقات وراثت بیان کی جاتی ہے تاکہ اصل مسئلہ پر ہر دو فریق کی رائے اور مسلک باآسانی معلوم ہو سکے۔

یہ خیال رہے کہ بالاتفاق سب کے نزدیک پہلے ترکہ میں سے حقوق شرعی مثلاً زکوٰۃ وغیرہ اگر کوئی ہوں، میت کی تجہیز و تکفین کے مصارف، قرضے اور وصیتیں پوری کی جائیں گی۔ اس کے بعد بقیہ علی ترتیب استحقاق وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔



حواشی اور حوالہ جات

- (۱) احکام الموارث صفحہ ۱۳۶ و فتاویٰ المیراث صفحہ ۲۴ نیز اس بحث کے لئے دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ ۵۲۱/۲
- (۲) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۴ یہ شیعہ فقہ فرائض کی مستند اور مشہور کتاب ہے نیز دیکھئے سراجی صفحہ ۴ والموارث الاسلامیہ صفحہ ۱۹۔
- (۳) بلوغ المرام صفحہ ۱۹۵ (متفق علیہ)
- (۴) جامع الاحکام ۷۸/۱ نیز امیر علی کا محمدن لاء (انگریزی) صفحہ ۱۰
- (۵) بلوغ المرام صفحہ ۱۹۷ بحوالہ نسائی و دارقطنی --- نیز یہ حکم عقلاً جس سیاست پر مبنی ہے وہ مخفی نہیں یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر قانون بھی قاتل کو ممنوع الہرث ٹھہراتے ہیں مثلاً فرانسیسی قانون (تفصیل کے لئے دیکھئے المقارنات التشريعیہ ۳۱/۳ یہ کتاب فقہ مالکی اور فرانسیسی قانون کے تقابل پر لکھی گئی ہے اور نہایت معلومات افزا کتاب ہے۔
- (۶) جامع الاحکام ۷۹/۱
- (۷) کتاب الام للشافعی ۳/۳
- (۸) اس کے متعلق سید امیر علی صاحب نے بہت عمدہ اور دلچسپ بحث کی ہے تفصیل کے لئے دیکھئے جامع الاحکام ۱۰۲/۱
- (۹) احکام الموارث صفحہ ۱۵۲ و جامع الاحکام ۷۶/۱
- (۱۰) شریفیہ صفحہ ۲، کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۹
- (۱۱) الموارث الاسلامیہ صفحہ ۳۶
- (۱۲) الانفال : ۷۵ والاحزاب : ۶
- (۱۳) دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۱۳ '۱۳ آیات مندرجہ تحت جزء (ج)، (د)، (ہ)
- (۱۴) دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۱۸
- (۱۵) احکام القرآن ابن العربی ۴۰/۱ و فروع الکافی صفحہ ۴۳ (یہ کتاب

شیعہ کی کتب احادیث میں نہایت معتبر بلکہ ان کی صحاح اربعہ میں سے ہے) بلکہ تمام کتب فرائض میں یہ چیز بیان ہوئی ہے۔

(۱۶) کتاب ہذا صفحہ ۱۵'۱۶ ' بلکہ شیعہ کے ہاں تو میت کی صرف ماں کی موجودگی میں بھی اس کے بھائی بہن محروم رہیں گے۔ دیکھئے تفسیر ابو الفتوح رازی ۱۲۴/۳ یہ بزرگ چھٹی صدی ہجری کے مشہور شیعہ محدث اور مفسر تھے۔ تفسیر فارسی میں ہے اس لئے عنوان اس طرح چھپا ہے جو عربی میں محل نظر ہے۔

(۱۷) شریفیہ صفحہ ۴۴ (حاشیہ) المواریت الاسلامیہ صفحہ ۳۶ (حاشیہ) نیز جامع الاحکام ۸۲/۱

(۱۸) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۸-۱۰ والمواریت الاسلامیہ صفحہ ۳۲-۳۶

(۱۹) یہ مسئلہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی ذہنی و علمی کرامات میں سے ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے المواریت الاسلامیہ صفحہ ۷۸۔

(۲۰) مثال کے طور پر دیکھئے احکام المواریت صفحہ ۱۲۹-۱۵۰

(۲۱) فتاوی المیراث صفحہ ۲۳-۲۴ (جو فارسی زبان میں شیعہ سنی ہر دو کی فقہ فرائض پر بہت عمدہ اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۱۰ سراجی صفحہ ۱۶-۱۷ (یہ حنفی قانون وراثت کی مشہور بلکہ درسی کتاب ہے۔) شریفیہ صفحہ ۲۳-۲۴ والمواریت الاسلامیہ صفحہ ۳۶۔

(۲۲) کتاب ہذا صفحہ ۱۵'۱۶ - نیز الدرالمختار ۳۵۸/۲ و سراجی صفحہ ۱۷ عالمگیری اردو ۹۱۰/۳ امیر علی کا محمدن لاء (انگریزی) صفحہ ۱۰۔

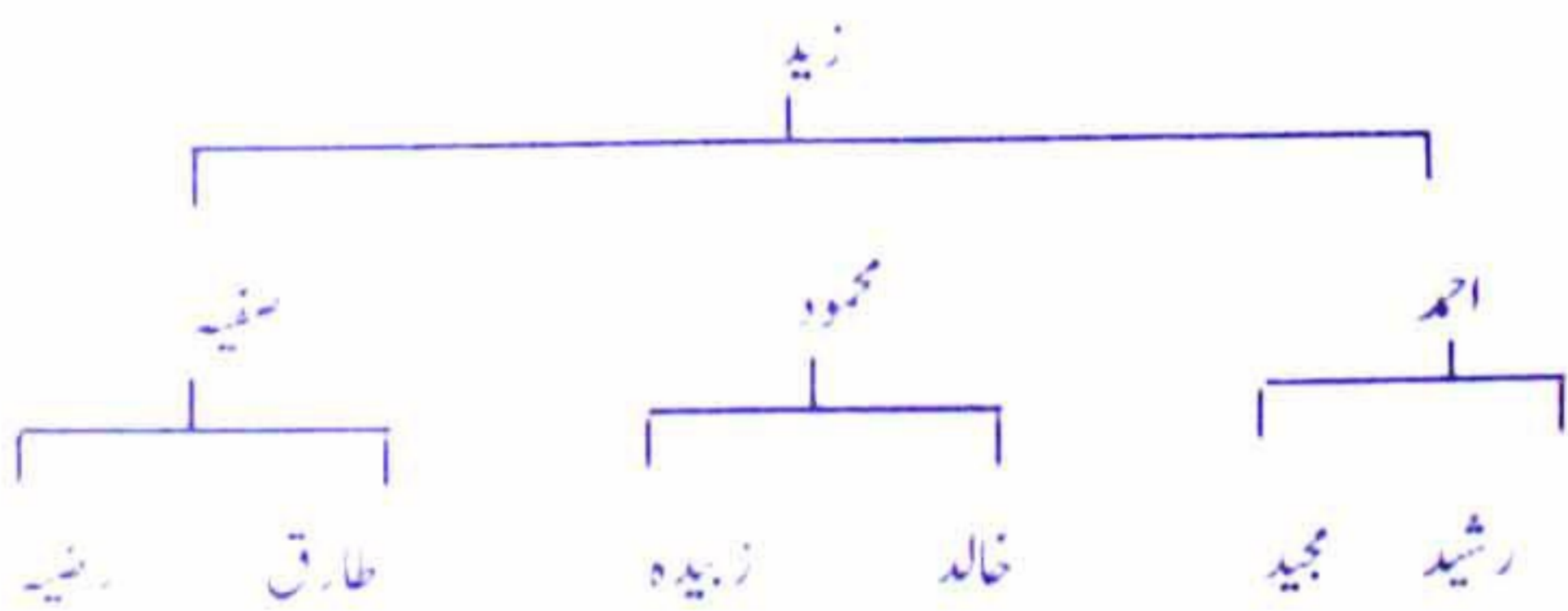
(۲۳) کتاب ہذا صفحہ ۲۴

(۲۴) شیعہ حضرات اولاد کی اولاد میں بیٹوں اور بیٹیوں سب کی اولاد کو لیتے ہیں لیکن اہل السنّت صرف بیٹوں کی اولاد کو - کیونکہ بیٹیوں کی اولاد حقیقتاً میت کی نہیں بلکہ کسی اور (بیٹی کے خاوند) کی اولاد ہوتی ہے والاصل حقیقتہ بالنسبۃ الی المجاز۔

(۲۵) اس کی مفصل بحث تو مقالہ کے آخری حصہ میں آئے گی (دیکھئے صفحہ ۱۰۰-۱۰۲ نیز ۱۰۵-۱۰۹) سردست اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ بطور اصول کلی کے اصول

نیابت یا قائم مقامی کا کوئی مذہب فکر (فقہ) بھی قائل نہیں ہے۔ جب تک ایک درجہ کا کوئی بھی وارث موجود ہے اس اصول کا اطلاق نہیں ہو گا۔ مثلاً ایک آدمی کے کچھ بیٹے بیٹیاں ہیں اور کچھ ایسے پوتے پوتیاں یا نواسے نواسیاں ہیں جن کے باپ یا ماں اس (اپنے باپ) کی زندگی میں مر چکے ہیں تو اس صورت میں ان پوتوں یا نواسوں کو کسی کے ہاں بھی اپنے مردہ باپ یا ماں کا قائم مقام تصور نہیں کیا جاتا۔ البتہ جب صلبی اولاد میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو تو اس صورت میں اہل سنت کے نزدیک صرف پوتوں اور پوتیوں کو اور امامیہ کے نزدیک نواسوں اور نواسیوں کو بھی قائم مقام اولاد سمجھا جائے گا۔

پھر قائم مقامی کی تعبیر میں بڑا اختلاف ہے۔ اہل سنت کے نزدیک قائم مقامی کا مطلب یہ ہے کہ قائم مقام کو اصل مورث کی طرح قرار دیا جائے مثلاً باپ کی عدم موجودگی میں دادا باپ متصور ہو گا ماں کی عدم موجودگی میں نانی کو ماں سمجھا جائے گا۔ اور اسی طرح اولاد کی عدم موجودگی میں پوتے پوتیوں کو اولاد سمجھ کر جائیداد علی الرؤس (Per Capita) تقسیم ہو گی۔۔۔۔۔ لیکن امامیہ کے نزدیک اولاد کی عدم موجودگی میں اولاد کی اولاد اپنے اپنے باپ یا ماں کی نمائندہ سمجھی جائے گی اور جائیداد ان میں علی المنسب (Per Stirpes) تقسیم ہو گی۔ اس تمام اختلاف کی تشریح نیز اولاد الاولاد کی وراثت پر شیعہ سنی موافق کی توضیح حسب ذیل مثال سے ہو گی۔



اب فرض کیجئے احمد زید کی زندگی میں مرتا ہے۔ اس صورت میں بالاتفاق سب کے نزدیک جائیداد کے وارث صرف محمود اور صفیہ ہوں گے اور اگر احمد محمود اور صفیہ تینوں زید کی زندگی میں مر جائیں تو اس صورت میں اہل سنت کے نزدیک صرف احمد اور محمود کی اولاد کو زید کے بیٹے بیٹیاں سمجھ لیا جائے گا اور

اس طرح جائیداد سات حصوں میں تقسیم ہو گی ہر لڑکا ۷/۲ اور لڑکی زبیدہ ۷/۱ لے گی۔۔۔۔۔ لیکن اسی دوسری صورت میں فقہ جعفری کی رو سے پہلے احمد، محمود اور صفیہ کے حصے نکالے جائیں گے جو علی الترتیب ۲/۵، ۲/۵، ۱/۵ ہوں گے پھر ہر ایک کا حصہ اس کی اولاد میں (مرد کو عورت سے دگنا کے اصول پر) تقسیم کیا جائے گا (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۳۱ تا شیعہ نقطہ نظر کے لئے مختار المسائل صفحہ ۱۵۰ تا ۱۷۰ سے مواد لیا گیا ہے۔ یہ ایران کے تین مشہور شیعہ مذہبی پیشواؤں یعنی آیت اللہ کاشانی اور آقائے نجم الملہ اور آقائے ناصر الملہ کے فتاویٰ اور تحریروں کا ترجمہ ہے اور فقہ شیعہ کی مستند کتاب ہے۔

(۲۶) احکام القرآن ابن العربی ۱/۱۴۰ و فروع الکافی صفحہ ۴۳ نیز جامع الاحکام ۱/۴۰ و فتاویٰ عالمگیری (اردو) ۱۰/۳۲۲۔



باب چہارم

وارثوں کے طبقات

فصل اول

فقہ حنفی کی رو سے

فقہ حنفی میں وارثوں کو دو طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) اصحاب الفروض۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ وارثوں میں سے "اصحاب الفروض" کون کون سے ہیں چنانچہ اولاً ایسے لوگوں کا حصہ نکالا جائے گا۔
ذوی الفروض کل بارہ ہیں (۱)

(۱) باپ (۲) ماں (۳) خاوند (۴) بیوی (۵) بیٹی یا بیٹیاں (جبکہ میت کی صلبی اولاد نرینہ موجود نہ ہو) (۶-۷) حقیقی و علاتی بہن یا بہنیں (جبکہ میت کی نہ اولاد موجود ہو نہ باپ) --- (۸-۹) اخیانی بھائی اور بہن (جبکہ میت کے نہ اولاد موجود ہو نہ باپ نہ حقیقی بھائی بہن)۔ (۱۰) پوتی (جبکہ میت کی اولاد میں صرف ایک لڑکی موجود ہو) (۱۱) دادا (جبکہ میت کا باپ موجود نہ ہو) (۱۲) دادی یا نانی (جبکہ میت کا باپ یا ماں موجود نہ ہو)

نوٹ نمبر ۱:- ان میں سے پہلے سات کا ذکر تو واضح طور پر قرآن مجید میں ہے نمبر ۸-۹ کے متعلق تمام امت کا اجماع ہے کہ سورہ النساء کی آیت نمبر ۱۲ اخیانی بھائی بہن کی میراث کے متعلق ہے (اس کی تفصیل میں الجھنا ہمارے لئے خارج از بحث ہے) نمبر ۱۰، ۱۱، ۱۲ کا ذکر قرآن حکیم میں نہیں ہے۔ بلکہ حدیث اور اجتہاد صحابہؓ

سے ثبوت ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان تین قسم کے وارثوں کے اصحاب الفروض ہونے میں شیعہ سنی کا اختلاف ہے۔۔۔ پوتی کے متعلق سند حضرت عبداللہ بن مسعود کے مشہور فیصلہ سے لی جاتی ہے (۲)۔ اسی طرح دادا دادی کے متعلق بھی مختلف "آثار واردہ" موجود ہیں۔ جن کی تفصیل ہمارے لئے غیر متعلق ہے۔

نوٹ نمبر ۲:- خیال رہے کہ اصحاب الفروض کا مطلب یہ نہیں کہ ان تمام وارثوں کو ہر حال میں حصہ ملے گا۔ یہاں فرض ضروری اور واجب کے معنوں میں نہیں بلکہ فریضہ یعنی مقررہ کردہ حصہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور آیات میراث میں یہ لفظ انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے (۳)۔ لہذا اصحاب الفروض سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کے مقرر کردہ چھ قسم کے حصوں یعنی $1/8$ ، $1/4$ ، $1/2$ ، $1/6$ ، $2/3$ میں سے کوئی ایک حصہ حسب حالات دیا جا سکتا ہو۔ پس جب وارثوں میں اس قسم کا کوئی شخص یا اشخاص ہوں تو ان کے حصے سب سے پہلے ادا کئے جائیں گے (۴)۔

نوٹ نمبر ۳:- یہ بات قابل غور ہے کہ بیٹا کسی صورت میں بھی صاحب فرض نہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ اصحاب الفروض صرف وہ وارث ہیں جنہیں قبل از اسلام عرب جاہلیت میں وراثت سے کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا اور قرآن اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے حصے مقرر کر دیئے (۵)۔

(۲) عصبات

جب اصحاب الفروض میں سے کوئی نہ ہو یا ان کے حصے نکالنے کے بعد کچھ بچ رہے تو یہ "بقایا جائداد" عصبات کو ملتی ہے۔

لفظ عصبہ دراصل جمع ہے عاصب کی اور پھر اس کی جمع عصبات بنائی جاتی ہے اور اس لفظ (عصبہ) کا اطلاق مفرد ثنی مذکر و مونث سب پر ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے معنی وہ مرد ہے جو باپ کی طرف سے رشتہ دار ہو (قرباۃ الرجل

لابیہ) یعنی بیٹا، بھائی، چچا یا ان کی اولاد نرینہ۔۔۔۔۔ عرب جاہلیت میں صرف یہی لوگ وراثت کے حقدار متصور ہوتے تھے قرآن حکیم نے چونکہ ذوی الفروض کے حصص مقدم کر دیئے اس لئے اب اصطلاح شرعی میں عصبہ اسے کہتے ہیں جو ذوی الفروض کے بعد وراثت کا حقدار ہو۔ اور اس میں بعض صورتوں میں (اور شیعہ کے نزدیک تمام صورتوں میں) برابر کے درجے کی عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

پھر عصبات کے مختلف درجات ہیں اس ترتیب درجات کو ”جہات عصبوت“ کہتے ہیں۔ یہ جہات مقرر کرنے کی بنیاد وہی آیات میراث ہیں جن سے اسباب میراث کے باب میں بحث گزر چکی ہے (۶) اور یہ جہات حسب ذیل ہیں (۷)

(۱) البنوة یعنی اولاد یا اولاد کی اولاد (نیچے تک) ہونا۔ (۲) الابوة یعنی باپ یا باپ کا باپ (اور اسی طرح اوپر تک) ہونا (۳) الاخوة (باپ کی اولاد) یعنی بھائی یا بھائی کی اولاد (نیچے تک) ہونا (۴) العمومتہ (باپ کے باپ کی اولاد) یعنی چچا یا چچائی اولاد (نیچے تک) ہونا (۵) والاء۔ پہلے طبقہ کی موجودگی میں دوسرے کو اور دوسرے کی موجودگی میں تیسرے کو کچھ نہیں ملے گا (۸)۔ و علی ہذا آخر تک۔ اور ایک ہی طبقہ یعنی جہت میں زیادہ قریبی کی موجودگی میں نسبتاً دور والے رشتہ دار کو کچھ نہ ملے گا۔ یعنی قاعدہ الاقرب فالاقرب ہر طبقہ کے افراد پر جاری ہوگا (۹)۔ اسی قاعدے کی بناء پر یتیم بھتیجا اپنے چچا کے مقابلے میں محبوب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ دونوں عصبات کے طبقہ اول میں سے ہیں لیکن بیٹا اپنے باپ سے باواسطہ تعلق رکھتا ہے اور پوتا باواسطہ۔ لہذا بیٹا اقرب اور پوتا البعد نسباً۔ اسی طرح بھائی کی موجودگی میں بھتیجا اور چچا کی موجودگی میں پچازاد بھائی محبوب ہو جائے گا۔

ایک بات ظاہر ہے کہ اگر عصبات میں سے کوئی بھی موجود ہوگا تو جائیداد پوری کی پوری تقسیم ہو جائے گی اور کچھ باقی نہ بچے گا لیکن اگر بالفرض ان تمام میں سے بھی کوئی نہ ہو تو تقسیم وراثت کے لئے علی الترتیب مزید نیچے

بھی طبقات مقرر کئے گئے ہیں اور گو یہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں کیونکہ پوتا اور پوتی عصبات کی قسم اول میں سے ہیں تاہم از زیاد معلومات کے لئے تمام مراتب استحقاق وراثت کو حاشیہ میں درج کیا جاتا ہے (۱۰)۔

فصل دوم

فقہ جعفری کی رو سے

فقہ جعفری میں نسبی وارثوں کے تین طبقات ہیں اور ہر طبقہ میں دو ذیلی طائفے ہیں۔ پہلا طبقہ دوسرے طبقہ کو اور دوسرا تیسرے طبقہ کو محبوب کر دیتا ہے۔ لیکن ہر طبقہ کے دونوں ذیلی طائفے بیک وقت وراثت پاتے ہیں (۱۱) اس طرح کہ ہر ذیلی طائفہ میں قریب کا رشتہ دار بعید کو محبوب کر دیتا ہے (۱۲) گویا حجاب بال شخص میں بیان کردہ قاعدہ ”ادلاء“ (۱۳) کی رعایت ایک حد تک وراثت کی طبقہ بندی میں کر لی گئی ہے اور دوسرا قاعدہ ”الاقرب فالاقرب“ ہر طبقہ کے دونوں طائفوں پر الگ الگ جاری ہوتا ہے۔

یہ تقسیم طبقات اس طرح پر ہے (۱۴) (ہر ایک طبقہ کے ساتھ اس کے دونوں ذیلی طائفے درج ہیں) پہلا طبقہ (الف) والدین (ب) اولاد اور اولاد کی اولاد نیچے تک - دوسرا طبقہ (الف) دادا دادی اور نانا نانی اوپر تک (ب) بھائی بہن اور ان کی اولاد نیچے تک - تیسرا طبقہ (الف) متوفی، اس کے والدین یا والدین کے والدین کے چچا یا پھوپھی اور ان کی اولاد در اولاد۔

(ب) متوفی، اس کے والدین یا والدین کے والدین کے ماموں یا خالہ اور ان کی اولاد در اولاد۔

زوج اور زوجہ وراثت سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے وہ ہر طبقہ کے ساتھ اپنا مقررہ حصہ پائیں گے اور ان کا حصہ نکالنے کے بعد متروکہ دیگر ورثہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ البتہ چونکہ شیعہ جواز متعہ کے بھی قائل ہیں۔ پس جب مرد اور

عورت میں متعہ ہوا ہو تو ایک دوسرے کا وارث نہیں ہو سکتا الا یہ کہ بوقت متعہ اس مضمون کی کوئی شرط کر لی گئی ہو (۱۵)

اب دیکھئے اس تقسیم کی رو سے پوتا پوتی طبقہ اول کے طائفہ دوم میں سے ہیں۔ پس اگر تو اس طائفے میں پوتے پوتیاں یا نواسے نواسیاں ہی ہوں گے (یعنی ایک ہی درجہ کے) تو اپنے باپ یا ماں کے قائم مقام ہو کر اس طرح وراثت پائیں گے۔ جس طرح صفحہ ۳۰-۳۲ پر حاشیہ میں تشریح کی جا چکی ہے (۱۶) لیکن اگر ان کے ساتھ اسی طائفے کا کوئی ”اوپر کے درجے کا وارث“ موجود ہو تو محبوب ہو جائیں گے حتیٰ کہ شیعہ تقسیم وراثت کی رو سے پھوپھی بھی اپنے یتیم بھتیجے یا بھتیجیوں کو محبوب کر دیتی ہے (۱۷) کیونکہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اہل السنّت کے ہاں تو صرف عصبات مذکر میں چلتا ہے۔ لیکن امامیہ کے ہاں بغیر امتیاز تذکیر و تانیث صرف بلحاظ رشتہ یہ قاعدہ جاری ہوتا ہے (۱۸)۔

اگر ان تینوں طبقوں میں سے کوئی بھی وارث موجود نہ ہو تو اہل السنّت کی طرح شیعہ میں بھی تقسیم وراثت کے لئے علی الترتیب مزید نیچے کے طبقات مقرر ہیں۔ فقہ جعفری کی رو سے تمام مراتب استحقاق وراثت اخیر تک یوں ہیں۔

(۱) طبقہ اولیٰ (۲) طبقہ ثانیہ (۳) طبقہ ثالثہ (۴) معق (آزاد کرنے والا)

(۵) ضامن جریرہ (عہدی وارث) (۶) امام علیہ السلام (۱۹)

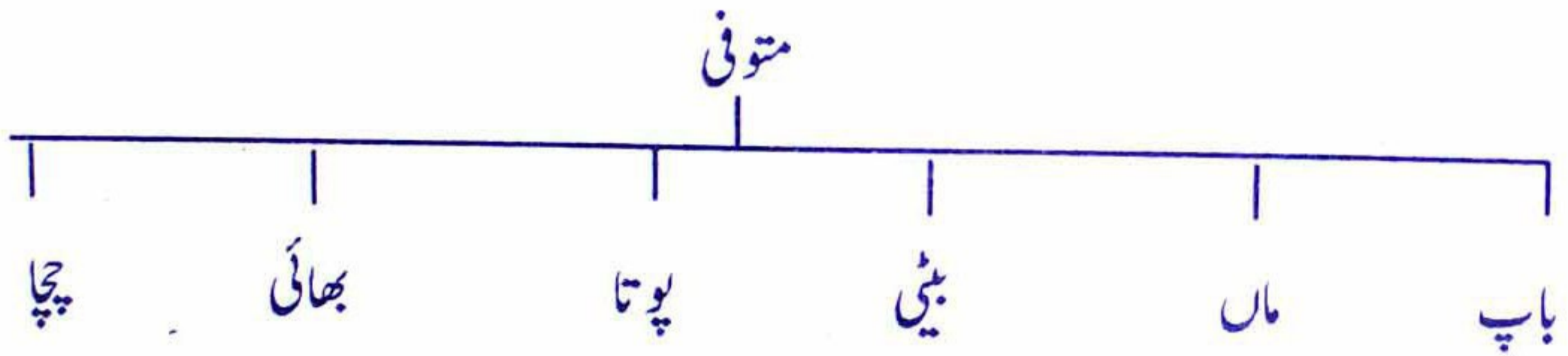
ان میں سے ہر پہلی قسم اپنے سے دوسری قسم کو محبوب کر دیتی ہے۔

البتہ زوجین ہر حال میں حصہ پائیں گے۔ (۲۰)

فصل سوم

شیعہ سنی فقہ کی رو سے پوتے کے متعلق احکام کا خلاصہ
مسئلہ زیر بحث کی اصل حقیقت ذہن نشین کرنے اور فقہ حنفی و فقہ
جعفری کے قوانین وراثت کو سمجھانے کے لئے گزشتہ دو فصلوں میں جو تفصیل بیان
ہوئی ہے اب اس کی عملی توضیح کے لئے چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان تمام مثالوں
میں پوتے پوتی وغیرہ (اولاد در اولاد) کو شامل رکھا گیا ہے۔

نمبر ۱

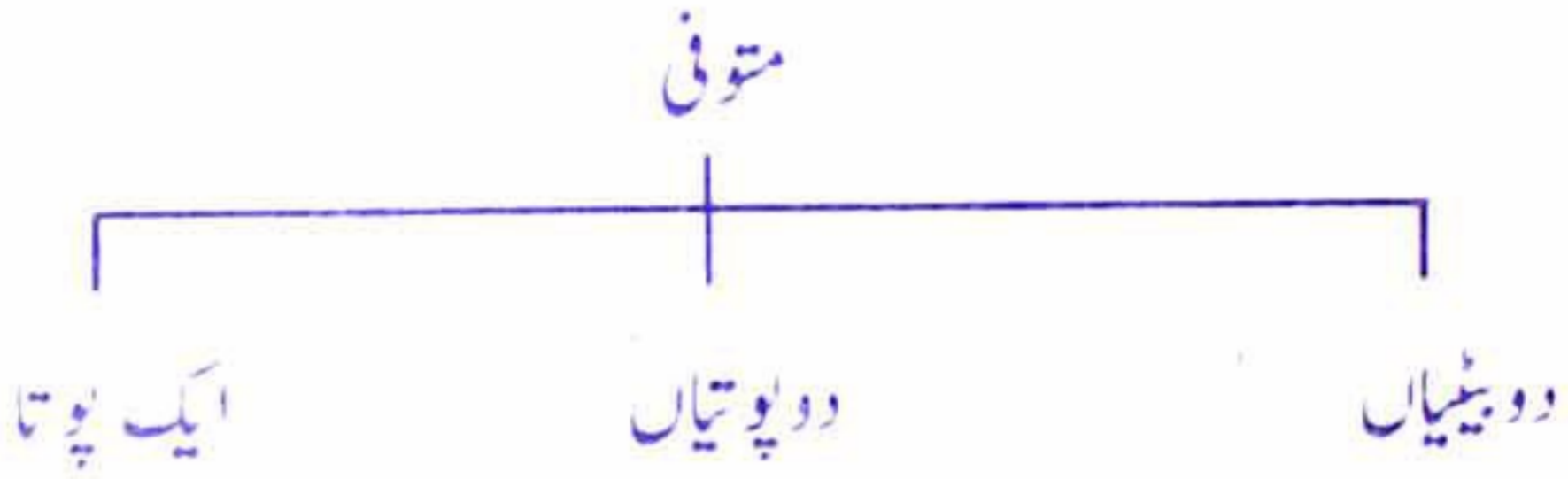


حنفی فقہ فرائض کے لحاظ سے :- باپ ماں اور بیٹی ذوی الفروض سے ہیں۔ اس
لئے پہلے ان کا حصہ $1/6 + 1/6 + 1/2 = 5/6$ نکالا جائے گا۔ باقی وارثوں میں سے
پوتا جہت اول کے عصبات میں سے ہے اور بھائی اور چچا تیسرے اور چوتھے درجے
کے۔ پس پوتا ان کو محبوب کر کے بقایا $1/6$ کا مالک ہوگا۔

شیعہ فقہ فرائض کے لحاظ سے :- باپ، ماں، بیٹی اور پوتا طبقہ اولی کے وارث ہیں
اس لئے یہ بھائی اور چچا کو محبوب کر دیں گے کیونکہ وہ طبقہ دوم و سوم میں سے
ہیں۔ پھر طبقہ اول کے چار وارثوں میں سے ماں باپ پہلے طائفہ کے ہیں اس لئے
پہلے انہیں ان کا حصہ یعنی $1/6 + 1/6 = 1/3$ دیا جائے گا۔ اب بیٹی اور پوتا ہر دو طبقہ
اول کے طائفہ دوم میں سے ہیں لیکن بیٹی پوتے کی نسبت قریب تر ہونے کے
باعث پوتے کو محبوب کر کے بقایا $2/3$ حصہ کی مالک ہوگی۔

نوٹ:- اسی صورت مسئلہ میں اگر بیٹی کی بجائے بیٹا ہو تو بالاتفاق بقایا $2/3$ بیٹی لے گا اور پوتا محبوب ہوگا۔

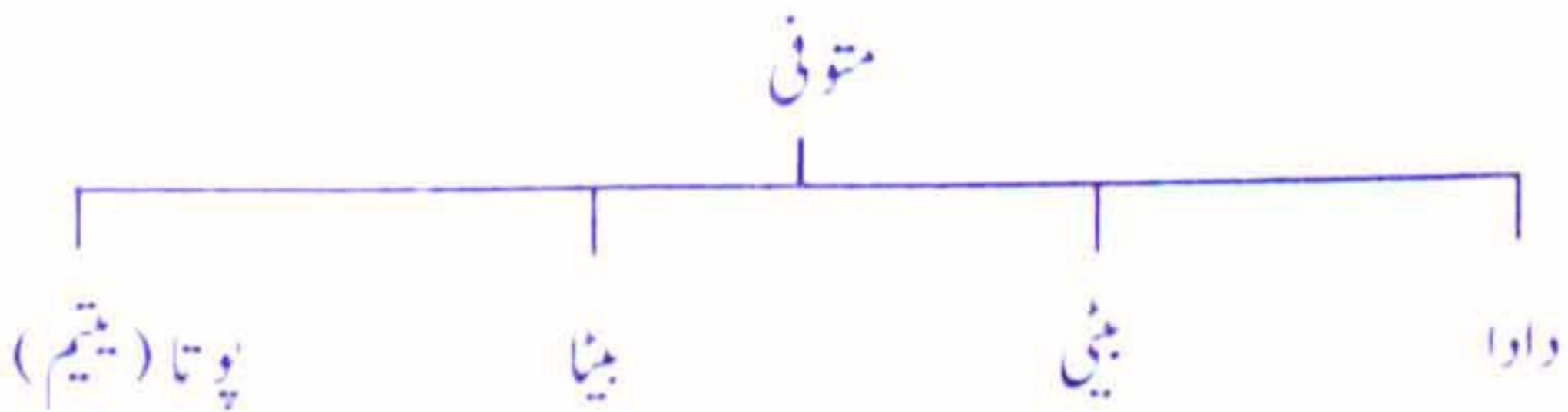
نمبر ۲



اہل السنّت کے نزدیک:- دونوں بیٹیاں بحیثیت ذوی الفروض $2/3$ لیں گی اور چونکہ پوتا اور پوتیاں ایک ہی درجے اور طبقے کے عصبات ہیں۔ اس لئے بقایا $1/3$ ان میں للذکر مثل حظ الانثیین تقسیم ہوگا (چاہے ان کے باپ مختلف بھی ہوں) دونوں پوتیاں $1/3$ کا $1/2 = 1/6$ اور اتنا ہی پوتا لے گا۔

شیعوں کے نزدیک:- تمام ورثاء طبقہ اول ہی کے ہیں۔ لیکن بیٹیاں قریب تر ہونے کے باعث تمام جائیداد کی مالک ہوں گی اور پوتا اور پوتیاں محبوب ہو جائیں گے۔

نمبر ۳



فقہ حنفی کی رو سے:- دادا بطور ذی الفروض $1/6$ لے گا۔ باقی جائیداد بیٹے اور بیٹی میں $4:2$ کی نسبت سے تقسیم ہوگی اور پوتا محبوب ہوگا۔

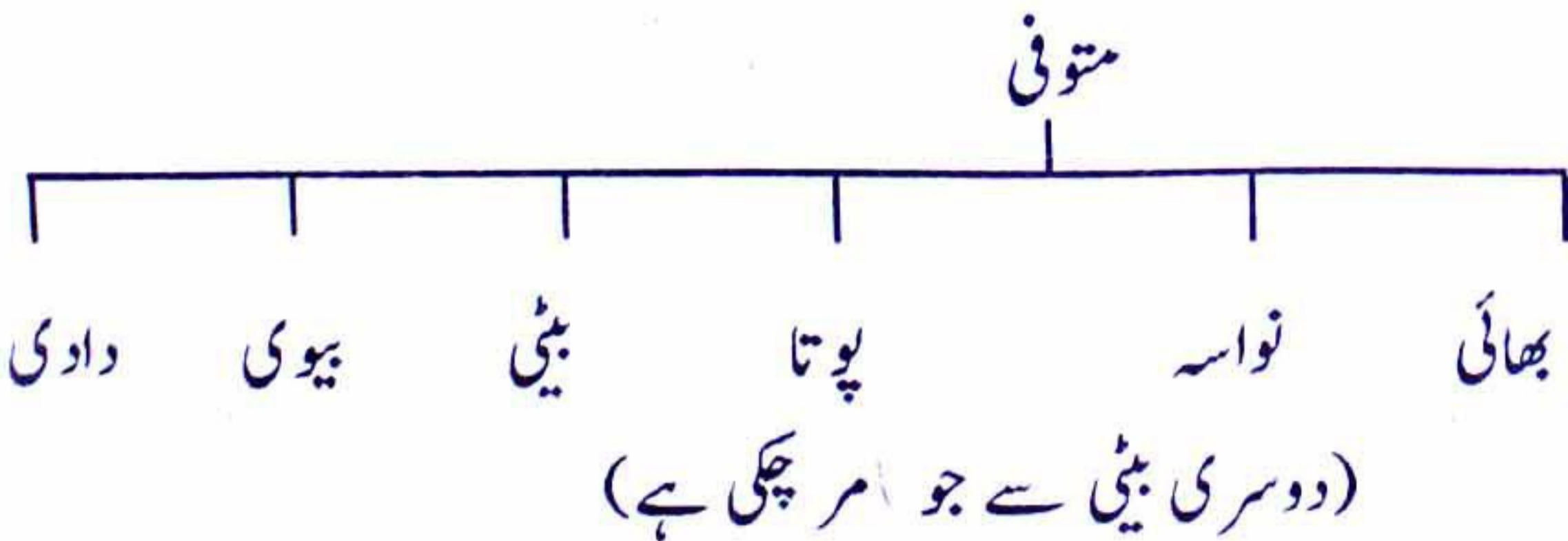
فقہ جعفری کی رو سے:- دادا طبقہ دوم کا وارث ہے لہذا محبوب ہو جائے گا۔
 طبقہ اول کے وارثوں میں سے بیٹا بیٹی ایک ہی درجے کے ہیں لہذا تمام جائیداد ان
 میں ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگی اور پوتا محبوب ہو جائے گا۔
 نمبر ۴



حنفی فقہ کی بناء پر:- باپ بطور ذی الفروض $1/6$ حصہ لے گا۔ نواسی ذوی الارحام
 میں سے ہے لہذا اسے کچھ نہ ملے گا اور بقایا $5/6$ دونوں پڑوتوں میں (حصہ
 برابر) تقسیم ہوگا یعنی ہر ایک کو جائیداد کا $5/12$ حصہ ملے گا۔

شیعہ فقہ کی بناء پر:- تمام وارث طبقہ اول کے ہی ہیں۔ باپ پہلے طائفے کا ہے
 پس اسے تو مقرر حصہ $1/6$ ملے گا دونوں پڑوتے اور نواسی طبقہ اول کے طائفہ دوم
 سے ہیں اور ان میں سے نواسی قریب تر ہے لہذا پڑوتے محبوب اور بقایا $5/6$ حصہ
 کی مالک صرف نواسی ہوگی۔

نمبر ۵



فقہ حنفی کی رو سے:- دادی، بیوی اور بیٹی ذوی الفروض ہیں پہلے ان کو حصہ دیا
 جائے گا جو بالترتیب $1/6 + 1/8 + 1/2 = 19/24$ ہوگا۔ نواسہ ذوی الارحام میں سے

ہے لہذا محروم ہوگا اور بقایا $5/23$ حصہ پوتے کو ملے گا کیونکہ وہ قسم اول کے عصبات میں سے ہے اور بھائی اس کی وجہ سے محبوب ہو جائے گا۔

شیعہ قانون وراثت کی رو سے:- دادی اور بھائی طبقہ ثانیہ میں سے ہیں لہذا وہ محبوب ہو جائیں گے بیوی کو اس کا مقررہ حصہ $1/8$ مل جائے گا۔ باقی تمام وارث اول کے ایک ہی طائفے سے ہیں لیکن بیٹی قریب تر ہونے کے باعث نواسے اور پوتے کو محبوب کر کے بقایا $1/8$ حصہ جائیداد کی مالک ہوگی۔

☆ ان چند مثالوں سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔

(۱) یہ کہ پوتا ہر حال میں جائیداد سے محروم نہیں ہوتا وہ ”محبوب الارث“ ہے ”ممنوع الارث“ نہیں یعنی اسلام میں محض یتیم ہونا کوئی ایسا دیوانی جرم نہیں کہ اس کی سزا میں جائیداد سے محروم کر دیا جاتا ہو (۲۱)۔ بلکہ پوتا بھی بعض خاص حالات میں محبوب ہوتا ہے جس طرح بھائی، بہن، چچا، دادا، بھتیجا وغیرہ دوسرے وارث بعض خاص حالات میں محبوب ہو جاتے ہیں۔

(۲) دوسرے اس تمام تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے (اور ویسے بھی یہ بات بالکل بدیہی سی ہے) کہ ہر وارث کی حیثیت بدلتی رہتی رہے اور اسی لحاظ سے اس کے حصہ میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ فقہاء نے (اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائے اور ان کی مسامحہ کی جزائے خیر دے) تتبع و استتباع کے ہر قسم کے وارثوں کو تمام ممکن پیش آمدہ حالات کو الگ الگ عنوانات قائم کر کے بھی بیان کیا ہے اس طرح سے وارثوں کی کل ۳۰ اقسام بنتی ہیں (۲۲)۔

اس سلسلہ میں ہمارے موضوع بحث یعنی پوتے اور پوتی کے احکام

خلاصہ حسب ذیل ہے (۲۳)

پوتا

(۱) جب میت کا کوئی بیٹا نہ ہو تو اسے بیٹا ہی سمجھا جائے گا (۲) بیٹے کی موجودگی

میں محبوب ہو جاتا ہے چاہے وہ اس کا باپ نہ ہو (۳) اسی طرح نچلے درجے کا پوتا (مثلاً پڑوتا) اپنے سے اوپر کی درجے کے پوتے سے محبوب ہو جاتا ہے۔ (۴) اور کبھی ترکہ ذوی الفروض میں پوری طرح تقسیم ہو جانے کے باعث محروم ہو سکتا ہے۔ (مثلاً جب کسی آدمی کی دو بیٹیاں، والدین اور ایک پوتا رہ جائے تو $1/3$ والدین اور $2/3$ بیٹیوں کو ملے گا اور پوتا محروم رہے گا)

پوتی

(۱) میت کا بیٹا نہ ہو بیٹی تو مثل بیٹی کے سمجھی جائے گی (۲) بیٹے کی موجودگی میں یا اپنے سے اوپر کے درجے کے پوتے سے بھی محبوب ہو جائے گی۔ (۳) صرف ایک صلبی بیٹی ہو یا اپنے سے اوپر کے درجے کی صرف ایک پوتی موجود ہو تو اس کے ساتھ بطور ذی فرض کے $1/6$ حصہ پائے گی (۴) اپنے بھائی یا چچا کے بیٹے کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی (۵) اگر $2/3$ میں سے اسے کچھ نہ مل رہا ہو (یعنی جب اوپر کے درجے کی ایک سے زیادہ بیٹیاں یا پوتیاں موجود ہوں) تو اپنے سے نیچے کے درجے کے پوتے کے ساتھ عصبہ ہو کر حصہ پائے گی (۶) اور اگر $2/3$ میں سے بھی اسے کچھ نہ مل سکتا ہو اور ساتھ عصبہ بنانے والا بھی کوئی نہ ہو تو اس صورت میں محبوب ہو جائے گی۔

یہ احکام اہل السنّت و الجماعت کے مذہب کے مطابق ہیں (۲۴)

شیعہ قانون وراثت میں پوتے پوتی اور نواسے نواسی کے احکام یکساں

ہیں (۲۵) یعنی (۱) اولاد نہ ہونے کی صورت میں ہر بیٹی یا بیٹے کی اولاد اپنے باپ یا ماں کا حصہ علی النسب پائے گی اور (۲) قریب تر بعید کو محبوب کر دیتا ہے۔

☆ اس وقت تک جو کچھ خامہ فرسائی کی گئی ہے اس کا ما حاصل یہ ہے کہ چچا کی موجودگی میں (اور شیعہ کے نزدیک پھوپھی کی موجودگی میں بھی) بھتیجا (یتیم پوتا) اپنے دادا یا دادی کی جائیداد سے بطور وراثت کچھ نہیں پاسکتا۔ اور یہ نتیجہ ہے

قرآن کے لفظ ”الاقربون“ اور ”اولی“ کی قانونی اور فقہی تعبیر کا (۲۶) --- لطف کی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ طریق تعبیر اور انداز فکر جدا جدا ہے لیکن نتیجہ بہر حال ایک ہی نکلتا ہے اور سچ پوچھئے تو مسئلہ کے باقی پہلو (مثلاً یہ کہ جب صرف پوتے پوتیاں وارث ہوں تو جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی؟ علی الرووس یا علی النسب؟؟) ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ اصلی معرض بحث اور نفس مدعا ”یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ“ میں یہی صورت ہے کہ وہ اپنے چچا کی موجودگی میں کیوں کر محبوب ہو سکتا ہے؟۔۔۔ سو اس کے متعلق ہر مکتب خیال کے فقہاء کا طریق استدلال اور اس کا نتیجہ گزشتہ اوراق میں پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی یہ فسانہ اپنے نقطہ کمال (Climax) تک نہیں پہنچا۔ اس کا ایک اور پہلو بھی آپ کے سامنے لانا ہے۔



حواشی اور حوالہ جات

- (۱) فتاویٰ عالمگیری جلد ۱۰/۲۲۱ نیز تمام کتب فقہ فرائض
- (۲) مصادر الاحکام الشرعیہ ۳/۱۲۳ نیز کتاب ہذا کا صفحہ ۴۹ دیکھئے
- (۳) الموارث الاسلامیہ صفحہ ۹
- (۴) کتب فرائض میں عموماً تمام حصوں پر فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کس کس صورت میں کس کس وارث کو کون سا حصہ ملے گا مثال کے طور پر دیکھئے الموارث الاسلامیہ صفحہ ۳۱ تا ۳۲
- (۵) Mohammeden Law F.B.Tyabji P.826
- (۶) کتاب ہذا صفحہ ۱۸-۱۹
- (۷) الموارث الاسلامیہ صفحہ ۴ سراجی صفحہ ۱۳
- (۸) یہ احناف کا مسلک ہے شوافع اور موالک کے نزدیک نمبر ۲ اور نمبر ۳ بیک وقت بھی وارث ہوتے ہیں۔ نیز مقابلہ کے لئے دیکھئے شیعوں کے تقسیم طبقات وراثت (صفحہ ۳۶-۳۷ کتاب ہذا) میں طبقہ ثانیہ۔
- (۹) المقارنات التشریحیہ ۴/۴۷ و شریفیہ صفحہ ۴۳-۴۴
- (۱۰) یہ ترتیب اس طرح پر ہے (۱) اصحاب الفروض (۲) عصبات (۳) معتق (آزاد کرنے والا) اور معتق کے عصبات (۴) الرد علی ذوی الفروض غیر الزوجین (یعنی خاوند یا بیوی کے علاوہ دوسرے اصحاب الفروض کو بذریعہ رد بقایا بھی تقسیم کر دینا) (۵) ذوی الارحام (وہ وارث جن کا تعلق میت کے ساتھ بذریعہ اس کی بیٹی یا بہن یا ماں یا پھوپھوی کے ہو) (۶) مولی الموالات (عہدی وارث) (۷) المقرانہ بالنسب علی الغیر یعنی وہ مجہول النسب آدمی جس کے حق میں متوفی نے کسی ایسی قرابت کا اقرار کیا ہو جو خود اس متوفی کے ذریعے نہیں بلکہ کسی اور واسطے سے قائم ہو سکتی ہو (۸) الموصی لہ بما زاد علی الثلث یعنی ایسا شخص جس کے متعلق متوفی نے اپنی تہائی سے زیادہ جائیداد کی وصیت کی ہو (۹) بیت المال

نوٹ:-

پہلی پانچ اقسام اہل السنّت کے نزدیک متفق علیہ ہیں آخری چار مراتب میں احناف شوافع اور حنابلہ کا جزوی اختلاف ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے الموارث الاسلامیہ علی

المذہب الاربعہ صفحہ ۱۵-۱۷

(۱۱) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۲ فتاویٰ المیراث صفحہ ۲۳-۲۴ اور امیر علی محمدن لاء (انگریزی) صفحہ ۹

(۱۲) البتہ طبقہ ثالثہ میں محض قرہبی کو وارثت ملتی ہے چاہے وہ کسی طائفے سے ہو دیکھئے مختار المسائل صفحہ ۱۶۶

(۱۳) کتاب ہذا صفحہ ۲۴-۲۵

(۱۴) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۲ نیز مختار المسائل صفحہ ۱۵۴

(۱۵) جامع الاحکام ۱/۷۱

(۱۶) نیز دیکھئے مختار المسائل صفحہ ۱۵۶ یہ کتاب ایران کے تین مشہور مذہبی رہنماؤں یعنی آیت اللہ کاشانی نجم الملہ اور ناصر الملہ کے فتاویٰ اور تحریروں کا مرتب اردو ترجمہ ہے۔ لہذا شیعہ فقہ کی مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

(۱۷) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۱۰

(۱۸) امیر علی کا محمدن لاء (انگریزی) صفحہ ۹

(۱۹) یہاں یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہر قسم کے وارثوں کی عدم

موجودگی میں اہل السنّت کے نزدیک سب سے آخر پر سرکاری خزانہ (بیت المال) وارث قرار پاتا ہے۔ (دیکھئے اہل السنّت کے مراتب استحقاق وراثت کتاب ہذا صفحہ

۸-۱۹) لیکن شیعہ وراثت میں بیت المال کے نام سے ہی بیزاریں۔ ان کے

زودیک بالکل ہی اوارث آدمی کا مال امام نائب علیہ السلام کا مال ہے اور نوبت امام میں وہ مال نائب امام یعنی مجتہد کو ملے گا۔ جو اس مال کو اس شخص کے فرہنگ میں تقسیم

کرے گا جس کا متوفی باشندہ تھا۔ (اوارث مال کے متعلق خزانہ کا طرہ۔ جہاں سے ملتا جلتا ہے دیکھئے کتاب ہذا صفحہ ۱۹ حاشیہ)۔۔۔ اس سے پہلے کی باتوں

مطالعہ بحث کے لئے دیکھئے امیر علی کی جامع الاحکام ۱/۷۱-۷۲ نیز ۵۵۔ بعد

(۱) دیکھئے مختار المسائل صفحہ ۱۶۵-۱۶۶

(۲۱) افسوس ہے کہ بعض حضرات کی طرف سے عمداً یا عدم واقفانہ بنا کر یہ مسئلہ پہلے

اسی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو اسلام بیزاری کے ثبات سے کم نہیں ہے۔

طلوع اسلام کراچی کے رسالہ ”یتیم پوتے کی وراثت“ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں --- ”ملا کا مذہب ہے کہ زید (متوفی داد) کی ساری جائیداد عمرو (بیٹے) کو مل جائے گی۔ حامد (یتیم پوتا) کو کچھ نہیں ملے گا (یہ پوری مثال کتاب ہذا کے صفحہ ۷۷ پر دی ہوئی ہے) اس کا قصور؟ یہی کہ وہ یتیم ہے۔ باپ کا سایہ نہیں اسے وراثت سے کیوں نہ محروم کیا جائے؟“ --- (دیکھئے تین اہم مسائل صفحہ ۱۴۴) --- اس قسم کی تحریروں کا مسئلہ سے نا آشنا لوگوں پر (جن میں عوام ہی نہیں خواص بھی شامل ہیں) جو اثر پڑا ہے اس کا اندازہ اس لطیفہ سے لگا لیجئے: ایک معمر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بزرگ سے دوران گفتگو مقالہ ہذا کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے ”بھئی میں تو اسی لئے اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں کے نام مکان منتقل کر رہا ہوں کہیں میرے بعد ان کے چچا ان سے جھگڑا نہ کریں۔“ میں نے تعجب سے پوچھا کہ جب آپ کے والد بزرگوار بھی زندہ نہیں اور مکاں بھی آپ کے نام ہے تو پھر آپ کو کیا فکر لاحق ہے؟ فرمانے لگے ”ارے میاں! یہ جو سنا ہے کہ جو یتیم ہو جائے اسے وراثت سے کچھ نہیں ملتا۔“ گویا ان کے خیال میں باپ کے مرنے پر چونکہ اس کی اولاد یتیم ہو جاتی ہے اس لئے وراثت سے محروم ہوگی --- انا اللہ وانا الیہ راجعون!

(۲۲) دیکھئے الموراریت الاسلامیہ صفحہ ۳۵ تا ۳۸ نیز جدول مولفہ علامہ ابن الہائم در کتاب مذکور

(۳۲) سراجی صفحہ ۷ تا ۹ و الموراریت الاسلامیہ صفحہ ۳۷-۳۸

(۲۳) سراجی صفحہ ۷ تا ۹ و الموراریت الاسلامیہ صفحہ ۳۷-۳۸ بدایہ المجتہد ۳۳۴/۲

(۲۵) فتاویٰ المیراث صفحہ ۱۴ جامع الاحکام ۳۹/۱ نیز بدایہ المجتہد ۳۳۶/۲

(۲۶) اور جیسا کہ آئے چل کر معلوم ہوگا ”اقربیت“ کی اس قدر تنقیح کی ضرورت اس لئے

درپیش آئی کہ اسلامی قانون وراثت میں اصول قائم مقامی بطور قاعدہ کلیہ کے عملاً ہرگز جاری نہیں ہو سکا۔ یہاں شروع ہی سے وراثت متعدد سمتوں میں روانہ ہوتی ہے۔ اگر اسے صرف ایک سمت (جہت) مثلاً فرع (اولاد) میں چلنا ہوتا تو سرے سے ”اقربیت“ کے قاعدے کی ضرورت ہی درپیش نہ آتی۔ اس پر بالتفصیل بحث کے

لئے دیکھئے کتاب ہذا کا دوسرا حصہ باب دوم صفحات ۷۳-۱۸۷



باب پنجم

مقام حیرت؟

اب تک جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یتیم پوتا "اقرابت" ہی کی تشریح کا "شکار" ہو رہا ہے۔ اس پر یہ خیال آسکتا تھا کہ شاید "اقراب" کی یہ تشریح (جس میں بظاہر اس لفظ کے عربی و نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر کے محض صرفی و نحوی پہلو کو سامنے رکھا گیا ہے) شاید کسی ایک یا چند منطقی دماغوں کی کاوش اور محض تعبیر الفاظ کی شعبہ گری اور قانونی جمناسٹک ہو۔ لیکن تعجب پر تعجب ہے کہ اقراب کی یہ تعبیر ایسی متفق و مجمع علیہ ہے کہ گزشتہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں آج تک کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ آپ وراثت کی کوئی کتاب اٹھالیں۔ چاہے وہ کسی مذہب فکر کی نمائندہ ہو، ہر جگہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ اور اس کی توضیح میں سب سے پہلی مثال ہی یہی دی ہوئی ملے گی۔ "ہس طرح بھتیجا اپنے چچا سے محبوب ہو جاتا ہے زبے قسمت!

پھر یہ بات صرف فقہاء تک نہیں رہ جاتی بلکہ اس کا سلسلہ آگے چلتا ہے اور وہ صحابہ تک یتیم پوتے کے محبوب ہونے کے بالکل واضح ثبوت بنتے ہیں۔ جن کا ذکر ابھی اسی باب میں ہوگا۔

سب سے زیادہ استدال حدیث "الحقوا الفرائض باهلها فسانقر فہو لاولی رجل ذکر" (متفق علیہ) سے کیا جاتا ہے (۱)۔ یعنی احباب الفرائض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ قریب ترین مردوں کو دے گا۔ میں نے اس حدیث کو دیکھ کر لیا جائے کہ "اقراب" کی طرف سے یہاں بھی "اولی" کا مفہوم "اہل بیت" سے ملتا ہے۔

ہوگی (۲) اور اس احتمال کو بھی مان لیں کہ یہ حدیث کسی خاص واقعہ سے متعلق ہو جس کی جزئیات کا ہمیں علم نہ ہو سکا ہو اور خاص اسی واقعہ یا اس جیسے واقعہ میں ”اولیٰ“ اپنے ان معنوں میں لیا جاسکتا ہو۔۔۔۔۔ تو بھی مندرجہ ذیل تصریحات کا کیا کیا جائے؟

(۱) صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ موجود ہے کہ

ولد الابناء بمنزلة الولد اذا لم یکن دونہم ولد ذکر ذکرہم کذکرہم وانثاہم کانثاہم۔ یرثون کما یرثون و یحجبون کما یحجبون۔ ولا یرث ولد الابن مع الابن (۳)

بیٹوں کی اولاد بیٹوں ہی کے حکم میں ہے جبکہ ان کے علاوہ (میت کا) اور کوئی بیٹا موجود نہ ہو۔ ان میں لڑکے لڑکوں کی طرح اور لڑکیاں لڑکیوں کی طرح میراث پائیں گے۔ اور ان میں اولاد ہی کی طرح احکام میراث و حجاب جاری ہوں گے اور بیٹے کی اولاد (پوتا یا پوتی) بیٹے کی موجودگی میں وراثت نہیں پائے گی۔

ان ہی زید بن ثابتؓ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا وافرَضَہُم زید بن ثابت یعنی زیدؓ تمام صحابہ سے بڑھ کر علم الفرائض کے ماہر ہیں۔ پھر ان کے اس فتویٰ پر تمام صحابہ کرامؓ نے اجماع کر لیا تھا (۴) اور امت کے کسی فرد نے گزشتہ چودہ صدیوں میں اس پر اعتراض نہیں کیا۔

خیال رہے کہ اس جگہ ولد الابن سے بوجہ لام معرفہ اور تکرار معرفہ کے صرف زندہ بیٹے کا بیٹا (یعنی وہ پوتا جس کا باپ زندہ ہے) مراد نہیں لیا جاسکتا اور نہ آج تک کسی نے یہ مطلب لیا ہے کیونکہ اولاد تو باپ کے ہوتے اس کی اولاد کو کچھ نہ ملنا خود قرآن سے بدیہی و صریحی طور پر ثابت ہے (۵) ثانیاً تکرار معرفہ میں ثانی سے اول ہی مراد لینا۔ اصول فقہ کا قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ جس کی بنا پر یہاں لازماً یہی معنی لئے جائیں۔ ثالثاً حدیث میں لفظ ”ولد“ بصورت نکرہ موجود ہے۔ یعنی پوتے صرف اس صورت میں وارث ہو سکتے ہیں جب ”کوئی بھی بیٹا“

موجود نہ ہوگا۔ رابعاً اگر زندہ بیٹے کا بیٹا ہی مراد ہوتا تو اس کے لئے سیدھی عبارت یوں ہوتی ولدا لیرث ولد الابن مع ابیہ

(۲) اسی صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا واقعہ درج ہے (۶) کسی شخص نے حضرت ابو موسیٰ اشعریٰ سے۔ جب وہ عہد عثمانی میں کوفہ کے حاکم تھے (۷)۔۔۔ پوچھا کہ ایک میت کے وارث اس کی بیٹی، پوتی اور بہن ہیں۔ ترکہ کیوں کر تقسیم ہو؟۔۔۔ انہوں نے نصف جائیداد بیٹی کو اور باقی نصف بہن کو دینے کا فتویٰ دیا اور پوتی کو محروم رکھا۔ لیکن ساتھ ہی سائل کو ابن مسعود کی خدمت میں بھیج دیا۔ انہوں نے بیٹی کو $\frac{1}{2}$ پوتی کو $\frac{1}{6}$ (جو مل کر $\frac{2}{3}$ یعنی دو بیٹیوں کا حصہ بنتا ہے) اور بہن کو بقایا $\frac{1}{3}$ دلایا اور کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے مسئلہ میں یہی فیصلہ دیا تھا۔ اہل السنۃ کی فقہ فرائض میں پوتی کے متعلق احکام اسی حدیث کی بناء پر بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں (۸)

اس واقعہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ دونوں صحابیوں میں سے کسی نے بھی پوتی کو اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام نہیں بنایا۔۔۔ اور ابن مسعود نے جو حصہ دلایا بھی تو ایک اور حیثیت سے

(۳) فروع الکافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت منقول ہے جس میں مختلف وارثوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کس کو کس پر ترجیح دی جائے گی اس میں آیا ہے (۹)

ابنک اولیٰ بک من ابن ابنک وابن ابنک اولیٰ بک من اخیک۔۔۔ الخ
تیرا بیٹا پوتے کے مقابلہ پر اور پوتا بھائی کے مقابلہ میں زیادہ حقدار وراثت ہے
پھر ان روایات میں ہر طرح غلطی اور ضعف کا احتمال، امکان تھا لیکن
مقام حیرت ہے کہ جہاں ہم دوسرے سینکڑوں معمولی فروعی مسائل پر علمائے امت
کو اختلاف کرتے، آثار و احادیث پر نہایت بے باکی سے جرح و تنقید کرتے اور فریق
دہائی کی تعبیر و تشریح کو خلاف عقل و نقل ٹھیراتے دیکھتے ہیں وہاں اس مسئلہ پر نہ

صرف یہ کہ کسی نے آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ کسی کو کبھی اس میں کسی قسم کی غلطی یا خرابی کا شبہ تک پیدا نہیں ہوا۔ کس کس کا حوالہ دیا جائے جبکہ مخالفت میں کہیں ایک لفظ بھی نہیں ماتا (۱۰)۔

اس ضمن میں راقم نے خصوصاً ان ائمہ کی طرف رجوع کیا جو اپنے اجتہاد اور عام مسلک سے مخالفت میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن اس مسئلہ پر سب کو ہمنوا پایا اس کی صرف ایک بہت بڑی مثال علامہ ابن حزم اندلسی کو لیتا ہوں۔ یہ پانچویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں اور انہوں نے تقلید کو بالکل چھوڑ کر اجتہاد مطلق کا دعویٰ کیا تھا۔ اندلس کے علماء نے اختلاف رائے کی بنا پر انہیں طعن و ایذا کی آماجگاہ بنا لیا تھا اور مقامی امراء کے دل میں ان کے برخلاف شورش پیدا کر کے انہیں خوفزدہ کرنا چاہا لیکن وہ کسی سے نہیں ڈرے۔ امام موصوف نہایت تیز زبان تھے اور مخالفین پر جرح کرنے میں بے باک اور سخت گو فقیہ ان سے بڑھ کر نہیں ہے (۱۱)۔

دوسرے بے شمار مسائل کے علاوہ خود میراث کے بعض مسائل (مثلاً عول) میں انہوں نے جمہور کے مسلک سے شدید اختلاف کیا ہے (۱۲)۔ لیکن اس مسئلہ کے متعلق نہایت خاموشی اور اطمینان سے لکھ دیا۔

ولا يرث مع الابن الذكر الا البنات والاب و الام و الزوج و الزوجة فقط (۱۳)

یعنی بیٹے کے ساتھ مل کر سوائے بیٹیوں، ماں باپ، خاوند یا بیوی اور کوئی وارث نہیں ہو سکتا۔

اور آگے چل کر صاف کہتے ہیں۔

ولا يرث بنو الابن مع الابن الذكر شيئاً اباهم كان او عمهم وهذا اجماع متيقن (۱۴)

یعنی بیٹے کے بیٹے (پوتے) بیٹے کی موجودگی میں کچھ بھی نہ پائیں گے چاہے وہ

(بیٹا) ان (پوتوں) کا اپنا باپ ہو یا چچا ہو۔۔۔ اور یہ بات قطعی یقینی اجماع سے ثابت ہے۔

لیکن یہ اجماع پھر بھی صرف اہل سنت کے لئے حجت ہو سکتا تھا۔ شیوخ (خوارج اور بعض معتزلہ مثلاً نظام کی مانند) حجیت اجماع کے ہی منکر ہیں (۱۵)۔ اور ویسے بھی قانون وراثت میں اہل سنت سے ان کا سخت اختلاف ہے۔ لیکن اس مسئلہ پر وہ بھی متفق ہیں۔ اگرچہ اس پر پہلے بھی تفصیلاً لکھا جا چکا ہے (۱۶)۔ تاہم مزید قطعیت اور ”ازالہ شبہات“ کے لئے مندرجہ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں۔

فلا میراث لولد ولد مع ولد ذکرا کان اوانثی۔ حتی انه لا میراث لابن ابن مع بنت۔ ومتی اجتمع اولاد الاولاد وان سفلو افاقرب منهم یمنع الابد۔۔۔۔۔
ولا یشارک الا اولاد فی الارث سوی الابوین والزوجین (۱۷)

یعنی کسی اولاد کی اولاد کو اولاد کے ساتھ وراثت ہرگز نہ ملے گی چاہے وہ (اولاد) بیٹا ہو یا بیٹی۔ حتیٰ کہ پوتا بھی بیٹی کے ہوتے ورثہ نہیں پاسکتا۔۔۔ اور جب بھی اولاد کی اولاد یا اور بھی نیچے درجے کی اولاد (اپنے سے اوپر کے درجے کی) اولاد کے ساتھ جمع ہو جائے تو زیادہ قریبی دور والے کو محروم کر دے گا۔۔۔ اور سوائے والدین یا زوجین کے اولاد کے ساتھ اور کوئی وراثت میں شریک نہیں ہو سکتا۔
الغرض اس تمام مسئلے کا سب سے زیادہ دلچسپ قابل توجہ اور نیا انٹرنیشنل پہلو یہی ہے کہ کہیں اس کی مخالفت کا سراغ نہیں ملا۔ (سوائے موجودہ حدیث کے) (۱۸)۔

آخر آج ہمیں یہ قانون کیوں ظلم اور نامتقلبات دکھائی دیتا ہے (۱۹) کیا گزشتہ ساڑھے تیرہ سو برس میں امت کے کسی خلیفہ یا امام کسی مجتہد ’محدث‘ فقہیہ سیاستدان اور کسی فرد میں اتنی عقل اور ہوش نہ تھا کہ اسے یہ مسئلہ پختہ اور وہ اس کے خلاف احتجاج کرتا۔ دوسرے بے شمار مسائل (اور جن میں سے بعض تو مضحکہ خیز حد تک معمولی ہیں) پر تو ہنگامہ آراء، ملامت اور اختلافات عہد صحابہ کے

لے کر آج تک موجود چلے آتے ہیں۔ خود وراثت ہی کے متعلق کئی مسائل میں صحابہ کرامؓ میں بھی (اور بعد میں بھی) اختلاف ہوئے اور ان تمام اختلافات کا ریکارڈ کتب حدیث و فقہ میں مل جاتا ہے۔ لیکن یہی ایسا مسئلہ ہے جس پر گویا کبھی کسی نے کچھ سوچا ہی نہیں۔

پھر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ زندگی میں شاذ پیش آتا ہو بلکہ روزمرہ کا معاملہ ہے اور صدیوں تک حکومت وقت کے قانون کی حیثیت سے نافذ رہا ہے۔ اور عدالتوں میں آئے دن اس قسم کے معاملات پیش ہوتے ہوں گے اور پھر بھی کسی آدمی کو نہ اس میں کوئی قباحت نظر آتی ہے نہ غلطی۔۔۔ تمام امت کی اس خاموشی کو محض کورانہ تقلید کہ دینا بھی چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ خصوصاً جبکہ ساتھ یہ دعویٰ بھی کر دیا جائے کہ اس مسئلہ پر تو نص قرآن میں موجود ہے اور آج تک سب ہی اس کی خلاف ورزی کرتے چلے آئے (۲۰)۔ یامظہر العجائب والغرائب! قرآن کا منصوص مسئلہ اور امت میں اس کو سمجھنے والے تیرہ سول سال تک غائب!!

عقل بسوخت زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

میں کہتا ہوں۔۔۔ اور ہر غور و فکر کرنے والا مسلمان اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔۔۔ کہ یقیناً کچھ ایسے حالات و وجوہات تھے جن کی بنائی پر اس قانون کو مکروہ و معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور آج جو نقطہ نظر میں تبدیلی آگئی ہے اور جذبات براہیختہ ہو رہے ہیں تو اس کے پس منظر میں بدلے ہوئے حالات اور ہمارے مدت سے رو بہ الحاد معاشرتی اور اقتصادی نظام کو بھی بڑا دخل ہے۔

افسوس ہے کہ آج تک خاص اس نیت سے ان حالات و وجوہات کا کھوج لگانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ جنہوں نے اس بظاہر اس قدر "مذموم" نظریہ پر حسن و خوبی کے "پردے" ڈال رکھے تھے لیکن مسئلہ کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈالنا نہایت نہ وری ہے اور اگلے باب میں اسی سے بحث ہوگی۔

حواشی اور حوالہ جات

- (۱) بخاری ۲۸۳/۳، مسلم ۵۹/۵ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ شیعہ کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے دیکھئے تفسیر ابو الفتح رازی ۱۳۳/۳
- (۲) اس پر مفصل بحث کتاب ہذا کے صفحہ ۷۳ تا ۸۰ پر کی گئی ہے۔ نیز دیکھئے تین اہم مسائل صفحہ ۱۹۵-۱۹۶
- (۳) بخاری ۲۸۵/۳
- (۴) عینی شرح بخاری ۲۳۸/۲۳
- (۵) النساء/۱۱ نیز دیکھئے مقالہ ہذا کا صفحہ
- (۶) بخاری ۲۸۵/۳
- (۷) مصادر الاحکام الشرعیہ ۱۲۶/۳
- (۸) جامع الاحکام ۱/۶۳ نیز دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۱۵
- (۹) الفروع من الجامع الکافی صفحہ ۴۳ (یہ کتاب شیعہ کے ہاں وہی درجہ رکھتی ہے جو بخاری اہل سنت کے نزدیک)
- (۱۰) نیز دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۶۷ تا ۷۱
- (۱۱) تاریخ فقہ اسلامی
- (۱۲) دیکھئے المحلی ۲۶۲/۹
- (۱۳) المحلی ۲۷۱/۹ مسئلہ نمبر ۱۷۲۵
- (۱۴) المحلی ۲۷۱/۹ مسئلہ ۱۷۲۶ نیز دیکھئے احکام القرآن ابن العربی ۱/۱۴۰۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابن حزم مطلقاً اجماع سے طے شدہ مسائل میں 'اجماع' کی اصل قرآن و سنت میں نہ ہو، مجتہد اجماع کے منکر ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے احکام کے لئے دیکھئے ان کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام ۱۳۹/۳
- (۱۵) اصول التشریح الاسلامی صفحہ ۳۰
- (۱۶) کتاب ہذا صفحہ ۳۶ تا ۴۰

- (۱۷) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام صفحہ ۱۰
- (۱۸) نیز دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۶۶ تا ۷۱
- (۱۹) مثال کے طور پر دیکھئے تین اہم مسائل صفحہ ۱۵۹-۱۶۰۔ دسمبر ۱۹۵۳ء کے بعد سے اس مسئلہ پر اخبارات میں جو بحث و تبصرہ شروع ہوا اس میں ہر جگہ مخالفت میں یہی بات دہرائی گئی ہے۔ نیز دیکھئے اس مسئلہ پر پنجاب اسمبلی کی شائع کردہ پبلک آراء خصوصاً اس کے صفحہ ۶۱ تا ۱۲۰ اور ضمیمہ (سپلیمنٹ) جس میں عوام کے خیالات و آراء کی اکثر حصہ میں اسی بات کا اعادہ ہے۔ کہ ”یہ قانون ظلم ہے اور سراسر نامعقول ہے“ وغیرہ۔
- (۲۰) اخبارات کی بحث کے علاوہ پنجاب اسمبلی نے اس مسئلہ پر جو آراء طلب کر کے شائع کی ہیں اس میں ”خصوصاً عوام کی آراء میں“--- بار بار اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ یہ ”مسئلہ ظلم ہے۔ قرآن کے برخلاف ہے اور اب قرآن کا اصلی قانون نافذ ہونا چاہئے۔“
- ان آراء کے مطالعہ کے بعد آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ یا تو علم دین اور فہم قرآن ہمارے زمانے میں دنیا سے بالکل رخصت ہو چکا ہے۔ یا پھر یہ ”دروازہ رحمت“ ہمارے ہی لئے کھلا ہے اور پہلے سب محروم ہی رہے۔---
- وكم من عائب قولا صحيحا= وآفته من الفهم السقيم



باب ششم

خاموشی کیوں؟

متفرق مطالعہ اور غور و فکر سے اس مسئلہ پر خاموشی کی حسب ذیل وجوہ سمجھ میں آتی ہیں:

(۱) عربوں میں زمینوں وغیرہ کی ملکیت کا کوئی دیوانی یا مالیاتی نظام نہ تھا کہ شخص متوفی کے بعد پٹواری اور تحصیلدار وغیرہ کے ذریعے نئے وارثوں کو قانونی حق ملکیت دیا جاتا ہو۔ ہر شخص اپنی شادی شدہ اولاد کو اپنی جائیداد کا کوئی حصہ اس کے گزارہ کے لئے دے دیتا تھا۔۔۔۔۔ (ہمارے دیہاتوں میں آج بھی اس کا رواج ہے کہ گو ملکیت باپ کے نام رہتی ہے لیکن شادی شدہ بیٹے کا پورا حصہ الگ کر کے اسے دے دیا جاتا ہے۔ اگرچہ قانونی طور پر کاغذات مال میں وہ اس حصے کا مالک باپ کی وفات کے بعد ہی بنتا ہے)۔۔۔۔۔ اور اس بیٹے کے اپنے باپ کی زندگی میں مرنے پر بھی اس مال یا زمین کا حق ملکیت اولاد کی طرف نہیں بلکہ پوتوں کی طرف منتقل ہو جاتا تھا اور نہ ہی پٹیا اس کے دعویدار ہوتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک تو کسی کا حق تسلیم کر لینا ہی ”سرکاری فیصلہ“ ہوتا تھا۔۔۔۔۔ غالباً اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہی دستور جاری رہا تا آنکہ بعد میں منظم حکومتیں اور دفاتر قائم ہوئے۔ چونکہ اس طرح بھی یتیم پوتوں کو چنداں نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ اس لئے مسئلہ قابل توجہ نہ بنا۔

(۲) اسلام نے فرد کو اپنی جائیداد پر سب سے زیادہ حقوق تصرف مثل بیع و بیہ وغیرہ کے دیئے ہیں۔ اور نہ اس کے اس حق تصرف کو بھاری نیسوں یا

عدالتی فیسوں کے ذریعے سے ناقابل عمل بنایا ہے اور نہ ہی کوئی فرد اس بنا پر کہ وہ بعد میں جائیداد کا وارث بننے والا ہے۔ اپنے مورث کے حق تصرف کو چیلنج کر سکتا ہے (۱)۔ مالک جائیداد اپنی زندگی میں جسے چاہے اور جتنا چاہے با آسانی دے سکتا ہے۔ پھر مسلمان کو وصیت کا حکم ہے (۲)۔ خصوصاً اقرباء کے لئے۔ تو ایک بچے مسلمان سے یہ بالکل مستبعد ہے کہ اپنے یتیم پوتوں یا دوسرے محتاج اقرباء کو (جن میں یتیمی اور قرابت --- تبرع کے دو پہلو موجود ہیں) کچھ دیئے بغیر مر جاتے ہوں (۳)۔ اس صورت میں بھی کوئی جھگڑا نہیں اٹھ سکتا۔

یہ ہمارے زمانے کے مسلمانوں کی جہالت کی انتہا ہے کہ وہ اس طرح مال دینے کو بھی گناہ سمجھنے لگے ہیں جیسا کہ میں نے مقالہ کے مقدمہ میں تحصیلدار صاحب کا واقعہ ذکر کیا ہے حالانکہ یہ فعل مستحسن ہی نہیں ضروری ہے۔ بشرطیکہ اس میں کسی کو نقصان پہنچانے کی نیت نہ ہو۔

(۳) اسلام کا ایک مستقل قانون نفقات ہے اور اسلامی عدالت کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کو جو بوجہ صفر سنی، افلاس یا نقص اعضاء وغیرہ کسی عارضہ کی وجہ سے دوسرے کا محتاج ہے اس کا نان و نفقہ اس شخص سے دلائے جس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے (۴)۔ اس شرعی قانون نفقات کی رو سے یتیم پوتے پوتیاں جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائیں۔ یا اگر ان میں سے کوئی اپاہج وغیرہ ہو۔ تو ان کا نفقہ (گزارہ الاؤنس) مقدار وراثت ان کے چچاؤں پر عائد ہوتا ہے (۵)۔ بلکہ اگر کسی شخص کے اقرباء میں سے کوئی ایسا نہ ہو جس پر اس کا نان و نفقہ لازم قرار دیا جا سکتا ہو۔ تو پھر یہ فرض بیت المال کے ذمے عائد ہوتا ہے (۶)۔ اس قسم کے انتظام اور قانون کے نافذ ہوتے ہوئے بھی یتیمی کے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

(۴) اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ کی بنیادی

ضروریات از قسم مکان، خوراک، لباس مہیا کرنے کے سامان پیدا کرے (۷)۔ مسلمانوں کی اکثر حکومتوں اور خصوصاً دور خلافت راشدہ میں اس پر عمل ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمان تو مسلمان ذمی ضعیف، معذور اور ناقابل روزگار بوڑھوں وغیرہ کے بیت المال سے وظائف مقرر تھے (۸)۔ اور صرف مدینہ کے لوگوں کے جو وظائف اور الاؤنس مقرر تھے اس کی مقدار تین کروڑ سالانہ تھی (۹)۔۔۔۔ اور یتامی کے لئے تو بیت المال میں خاص حقوق ہیں (۱۰)۔ یعنی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ اپنی طرف سے بے آسرا یتامی کے لئے وظائف مقرر کرے۔ اسلامی حکومتوں میں قاضی (مجسٹریٹ) کے فرائض میں سے تھا کہ وہ اپنے علاقہ (Jurisdiction) میں یتامی کے معاملات کی نگہداشت رکھے (۱۱)۔

تجربہ شاید ہے کہ اگر ایسا انتظام ہو تو یتیم ہونا "مصیبت" کی بجائے ایک "صفت" (Qualification) متصور ہونے لگے۔ اس کی ایک مثال ہمارے اپنے زمانے میں ملتی ہے حکومت نے بھارت سے آنے والے مہاجرین کے لئے گزارہ الاؤنس بھی مقرر کئے تھے۔ اکثر مہاجرین کو دیکھا جو یہ چاہتے تھے کہ زمین وغیرہ چاہے الاٹ ہو یہ نہ ہو، گزارہ الاؤنس ملتا رہے۔ کیونکہ فطرت انسانی "نفع عاجل" کو زیادہ پسند کرتی ہے۔

(۵) اسلامی قانون وراثت میں (جبکہ وہ عملاً صحیح طور پر نافذ ہو) جائیداد صرف باپ یا دادا ہی کی طرف سے حاصل نہیں ہوتی کہ اگر یہ دروازہ بند ہو جائے تو لازماً آدمی بے نواہی ہو کر رہ جائے گا۔ بلکہ اس ہمہ گیر قانون میں ماں، باپ، خاوند، بیوی، بہن، بھائی، چچا وغیرہ سب ہی ذریعہ وراثت ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص سب طرف سے ہی وراثت سے محروم ہو جائے۔ رہا بعض اوقات کسی خاص طرف سے محبوب ہو جانا تو یہ حالت صرف پوتے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ چھ اصلی وارثوں کے

علاوہ باقی ہر شخص جب حرماں کی زد میں آ سکتا ہے۔۔۔۔ اور یہی غالباً سب سے بڑی وجہ ہے کہ کسی کو خاص پوتے کے حجب ہونے میں کوئی نامعقولیت نظر نہ آئی (۱۲)۔

پھر جن صورتوں میں یتیم پوتا محبوب ہو جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ حالت میں وہ قابل رحم ہی ہوتا ہے۔ کئی صورتوں میں اسے ماں کی طرف سے باپ کی نسبت بھی زیادہ جائیداد مل سکتی ہے۔ کتنی دفعہ بالغ اور صاحب لاد و جائیداد پوتے ہو سکتے ہیں۔ بعض دفعہ دادا جائیداد نہیں بلکہ قرضے چھوڑ کر مر سکتا ہے جن کی ادائیگی اس صورت میں چچا پر واجب ہو گی۔ اکثر صورتوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ خود چچا ہی اس سے کم سن اور مفلس رہ گیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود یتیم کا باپ اس قدر دولت چھوڑ مرا ہو جو اس کے دادا کو کبھی نصیب نہ ہوئی ہو۔ الغرض ”یتیم“ کے ساتھ ہی ایک ”انگوٹھا چوستے ہوئے لاوارث بچے کا تصور“ حقائق سے زیادہ جذبات پر مبنی ہے۔۔۔ اب رہا بعض دفعہ ”قابل رحم“ ہونا تو اس میں یتیم پوتے کے ساتھ بیوہ بہن، نادار بھائی اور مفلس چچا بھی شریک ہیں۔ لہذا پوتے کو بالخصوص ”ہدف ستم“ سمجھنے کی کوئی خاص وجہ ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔

(۶) معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مسئلہ عہد صحابہؓ سے چلا آ رہا ہے اور ہر مذہب فکر کے فقہاء نے اس پر اجماع کر لیا تھا۔ اور کتاب و سنت پر ایمان، اجماع کا احترام اور ماہرین فن کی تحقیق پر اعتماد اس زمانے کے مسلمانوں کا طرہ امتیاز تھا۔ امت کے بہترین دماغوں کا کسی مسئلہ پر متفق ہو جانا ان کے نزدیک سب سے بڑی حجت تھی (۱۳)۔ اور اس کے بعد ان کے ذہنوں میں کسی اعتراض کا ابھرنا ہی دشوار تھا۔

(۷) اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے

بارے میں جداگانہ رائے زنی درست ہو سکتی ہے۔ نہ کسی دوسرے نظام زندگی کے اندر اس کے کسی جزء یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ہر جزء دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی کام کر سکتا ہے اور اس کی خوبی یا قباحت کے متعلق صحیح رائے اسی وقت قائم کی جا سکتی ہے جب کہ پورے نظام اسلامی کے تناسب اور عمل میں اسے کام کرتے ہوئے دیکھا جائے۔ قانون وراثت اسلامی نظام حیات کا ایک جزء ہے اور اس نظام حیات کا اپنا ایک مخصوص نظام معیشت، نظام معاشرت، نظام اخلاق، نظام حکومت اور نظام تعلیم و تربیت ہے اور قانون وراثت کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا قانون بہہ قانون وصیت اور قانون نفقات بھی ہے اور ان سب کا ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ ہونا اور کام کرنا ضروری ہے اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ قرآنی احکام وراثت اس وقت نازل اور نافذ ہوئے جب ایک مکمل اسلامی نظام اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکے تھے۔ ایسے تربیت یافتہ معاشرہ میں یتامی کے لئے مشکلات کا پیدا ہونا ہی مستبعد معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ پر تعجب، حیرت، نفرت اور تنقید کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب اسلامی نظام کی تمام کڑیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور اکیلا نیم جان قانون وراثت نظام اسلامی کے دیگر اجزاء کے ہجر میں سوگوار رہ گیا اور خود بھی قابل ماتم نظر آنے لگا۔

کم از کم برصغیر پاک و ہند میں یہ مسئلہ (یعنی اس پر اعتراضات) انگریزی اقتدار کے بعد ہی پیدا ہوا ہے جس میں مدت تک قرآن کے مقرر کردہ چھ اصلی اور لازمی وارثوں (بیٹا، بیٹی، ماں، باپ، بیوی، خاوند) میں سے پانچ کو نظر انداز کر کے ہندو رواجی قانون کے مطابق صرف ایک قسم یعنی بیٹوں اور ان کی اولاد کو حصہ دیا جاتا رہا (۱۴) اور بدلے ہوئے ماحول اور غیر

اسلامی معاشرت و معیشت نے اس رواج کو قانون شرعی کے مقابلے پر زیادہ پسندیدہ اور جاذب نظر بنا دیا۔ یہ سہا رواج کی محبت اور قانون شرعی سے عملی بعد اور لا علمی کا نتیجہ ہے کہ آج عام مسلمانوں کو ---- یتیم پوتے کا اپنے چچا کی موجودگی میں دادا کی جائیداد سے حصہ نہ پاسکنا اور کسی نوجوان بے اولاد بیوہ کو اس کے خاوند کی جائیداد سے (نکاح ثانی پر پابندی لگائے بغیر بلکہ اس کی اجازت دے کر) حصہ ملنا ---- دونوں فعل یکساں نا معقول اور لغو دکھائی دیتے ہیں۔

چنانچہ اگلے حصے میں یتیم پوتے کے محبوب الارث ہونے کے مسئلہ کے اس نئے پہلو یعنی اس پر اعتراضات ، ان کے محرکات اور پیش کردہ اصلاحات و ترمیمات اور ان کے مضممرات پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔



حواشی اور حوالہ جات

- ۱- ہمارے رواجی قانون اور اسلامی قانون وراثت کے اس لحاظ سے تقابلی کے لئے دیکھئے رسالہ ”یتیم پوتے کا حق وراثت“ از سید غلام احمد پلیڈر منگمری صفحہ ۱۳-۱۴۔
- ۲- اس پر مفصل بحث کتاب ہذا ۹۸ تا ۱۰۲ پر آرہی ہے۔
- ۳- کتب فتاویٰ میں پوتوں کے متعلق وصیت کے بعض خاص پیچیدہ سوال ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ کس طرح وصیت کرتے تھے جس سے پوتے کو حصہ بھی بیٹے کے برابر مل جائے اور وصیت بھی $1/3$ سے زیادہ میں نہ ہو مثلاً ایک آدمی مر گیا۔ اس نے چھ بیٹے ایک پوتا اور ایک پوتی چھوڑ دی اور وصیت یہ کی کہ پوتے کو ایک بیٹے کے حصے کے برابر ملے اور پوتی کو $1/3$ حصہ جائیداد میں سے پوتے کا حصہ نکلانے کے بعد بقایا کا $1/3$ ملے۔ اب تقسیم ورثہ کیوں کر ہو؟ جواب: ہر ایک بیٹا $2/15$ پوتا بھی $2/15$ اور پوتی $1/15$ ملے گی۔ (دیکھئے مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ $3/37$)
- ۴- فتاویٰ عالمگیری $2/618$
- ۵- فتاویٰ عالمگیری $2/607$ بلکہ باپ کے مفلس ہونے کی صورت میں بھی پوتوں کا نفقہ عدالت دادا پر واجب کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ ایضاً
- ۶- فتاویٰ عالمگیری $6/618$
- ۷- اسلام کی اقتصادی نظام صفحہ ۳۵ (بحوالہ لکھنؤ ابن حزم) نیز اسی کتاب کا صفحہ ۱۲۹ اور ۱۳۹ تا ۱۵۶
- ۸- الفاروق صفحہ ۱۷۵ بحوالہ کتاب الخراج
- ۹- الفاروق صفحہ ۷۷ بحوالہ یعقوبی
- ۱۰- احکام القرآن للجصاص $2/67$ اور اصل تو اس بارے میں قرآن کا صم صریح موجود ہے دیکھئے الانفال $31/$ والحشر $7/$ ۔۔۔۔۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے

کہ دور انحطاط میں مسلمان حکمرانوں نے تو اپنے اس قسم کے فرائض سے روگردانی اور تغافل شروع کر دیا۔ لیکن غیر مسلم حکومتوں نے اس قسم کے قوانین اپنانے شروع کر دیئے۔ انگلستان میں ۱۸ویں صدی کے بعد اور Poor Law اور بعد میں Social Security Act نافذ ہوئے۔ جرمنی میں متعدد قسم کی پینشنیں اور الاؤنس اور سرکاری گھر Shelter Homes وغیرہ رائج ہوئے۔ تفصیلات کے لئے کیمبرج کی ”تاریخ یورپ“ اور امریکن فاضل E.M.Burns کی کتاب (American Social Security System) ملاحظہ فرمائیں۔

Muslim Institutions : page 148 ویسے اسلامی فقہ یا سیاسیات کی ہر -۱۱

کتاب میں جہاں جہاں بھی ”منصب قضاء“ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بات بیان کی گئی ہے۔ اس وقت یہی حوالہ مستحضر تھا۔

نیز دیکھئے غلام دستگیر نامی کا مکتوب مطبوعہ اخبار نوائے وقت لاہور مورخہ ۷ ادا سمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳ کالم ۵-۶-۷ -۱۲

اور یہ بہت بڑی نا انصافی بلکہ جہالت ہے کہ اکابر مجتہدین امت کے متفقہ فیصلوں کے اتباع اور جاہل آباء کی کورانہ تقلید میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے اور سب کو ایک ہی لکڑی ہانک دیا جائے۔ -۱۳

لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد گورنری (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء) میں مسلمانان ہند کے تمام آئین و قوانین طاق نسیاں پر رکھ دئے گئے اس کے قریباً پچاس برس بعد بنگال اور مدراس کی صوبائی حکومتوں نے اصلاح احوال کی کچھ کوشش کی لیکن تمام نظام اس قسم کا ہو چکا تھا کہ یہ تدبیریں موثر ثابت نہ ہو سکیں (دیکھئے جامع الاحکام -۱۴
- (۲/۱)



دوسرا حصہ

مسئلہ کا جدید پہلو

باب اوّل

پس منظر:

اگر بغور دیکھا جائے تو اس مسئلہ کی مخالفت میں دو طرح کے عنصر پیش نظر آتے ہیں۔

(۱) عوام کا وہ حصہ جو رواج سے الفت اور اسلام سے روایتی وابستگی کے دو متضاد عوامل کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ ان کا اطمینان قلب اس میں ہے کہ کسی طرح اسلام رواج کی تائید کر دے۔ مسئلہ زیر بحث کے متعلق ان لوگوں کی واحد دلیل یہی ہے کہ یہ جذبہ رحم شفقت کے برخلاف ہے۔ لہذا یہ اسلامی حکم نہیں ہو سکتا۔ قطع نظر اس بات کے کہ قانونی مسائل میں محض جذبہ رحم و شفقت کو کہاں تک مدار استدلال بنایا جا سکتا ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ان لوگوں کا یہی جذبہ رحم، اسلامی احکام وراثت کی ہی متعدد ایسی صورتوں میں --- جن کی بنیاد ہی مودت و رحمت پر ہے۔ سنگدلی میں بدل جاتا ہے مثلاً بوڑھی سوتیلی ماں کو باپ کی جائیداد سے یا نوجوان بے اولاد بھانج (بیوہ) کو اس کے خاوند کی جائیداد سے حصہ دینا کس قدر ناگوار بلکہ خلاف عقل اور باعث فساد نظر آتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اپنے تحت الشعور میں یتامی پر شفقت سے زیادہ رواج کی محبت سے متاثر ہیں۔ نیز ایسے لوگوں سے کسی قسم کی علمی اور اصولی بحث و استدلال بے معنی ہے لہذا یہ طبقہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہو جاتا ہے (۱)۔

۲- دوسرا گروہ جو اس مسئلہ کی عملی و فقہی طریقہ سے مخالفت کر رہا ہے

ان حضرات کا ہے جو فہم دین کے لئے حدیث رسول ﷺ کی ضرورت، اہمیت اور حجیت کے قائل نہیں ہیں اور قرآن اور صرف قرآن کریم کو ہی حل مسائل کے لیے کافی خیال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یتیم پوتے کو ازورئے قرآن چچا کی موجودگی میں بھی اپنے دادا کی جائیداد سے وراثت مل سکتی ہے۔ ان کے نزدیک قوانین وراثت کے بارے میں فقہاء و ائمہ سے قرآن کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی بلکہ قرآنی اصولوں کی صریح مخالفت بھی (۲) اور پھر تمام امت ان کی کورانہ تقلید کا شکار ہو کر رہ گئی ورنہ اس مسئلہ پر تو قرآن کا فیصلہ بالکل واضح تھا (۳)۔

اگرچہ طریق فکر میں کسی وحدت کے نہ ہونے کے باعث اس مکتب خیال کے مختلف مفکرین کے استدلال بھی مختلف اور بعض صورتوں میں باہم دگر مخالف بھی ہیں۔ تاہم چونکہ ان دلائل کے ساتھ ”قرآنی“ ہونے کا دعویٰ موجود ہے لہذا ان دلائل اور ان کے نتائج پر ٹھنڈے دل سے اور قرآن کریم ہی کے احکام کی روشنی میں غور کرنا ضروری ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ حدیث کی حجیت کا انکار کرنے والا گروہ اسلام میں بالکل نیا نہیں ہے جو امت کے طویل فکری انحطاط اور فقہی جمود کے رد عمل اور عصر حاضر کے عملی و عقلی مقتضیات کی پیداوار ہے۔ یہ طبقہ اس وقت بھی موجود تھا جب امت میں علمی حرکت اور روح اجتهاد اپنے شباب پر تھی --- وہ روح اجتهاد جس نے ابو حنیفہؒ کو اپنے اسلاف کے متعلق یہ کہنا سکھایا تھا کہ ”وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی“ اور جس کی بنا پر امام مالکؒ نے کہا تھا کہ ”رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا قول رد و قبول کے قابل نہ ہو (۴) --- ہاں تو امت کے اس ”سنہری دور“ میں بھی اس خیال کے لوگ موجود تھے۔ چنانچہ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الام کے ساتویں حصے کتاب جماع العلم میں ایک باب

باندھا ہے جس کا عنوان ہے ”باب حکایۃ قول الطائفۃ التی ردت الاخبار کلھا“ (یعنی اس جماعت کے اقوال کے بیان کا باب جس نے تمام حدیثوں کو رد کر دیا۔) اس باب میں انہوں نے اسی مکتب خیال کے ایک ایسے آدمی سے اپنے طویل مکالمہ و مناظرہ کا ذکر کیا ہے جو اپنے گروہ کے علماء میں سے شمار ہوتا تھا (۵)۔

دوسرے مختلف مذاہب فکر کے اختلافات کی طرح اس گروہ کے بعض قدیم اختلافات کا تذکرہ کتب حدیث و فقہ میں ملتا ہے مثلاً یہ قرآن کے تمام احکام یکساں ہیں۔ ان میں فرض، واجب، مستحب، مباح یا عام خاص وغیرہ کی تقسیم ناجائز ہے یا مثلاً یہ کہ جس شخص نے کوئی بھی ایسا عمل کیا جس پر نماز یا کم از کم زکوٰۃ کا لفظ بولا جا سکتا ہے اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اس کے لئے کوئی وقت نہیں ہے گو وہ ہر دن کو دو رکعت پڑھے یا پورے زمانہ میں دو رکعتیں پڑھے یا مثلاً یہ کہ جو چیز قرآن میں نہ ہو وہ کسی پر فرض نہیں ہے۔ وغیر ذلک (۶)۔۔۔ لیکن تعجب ہے کہ یتیم پوتے کے محبوب الارث ہونے کے مسئلہ پر اس گروہ کے بھی کسی شخص کا کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔۔۔ کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزرا اور نہ ہی موجودہ ”مفکرین قرآن“ حضرات نے اس قسم کی کوئی چیز پیش کی ہے۔

بہر حال اس مسئلہ کی مخالفت کا بیسویں صدی عیسوی سے پہلے کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے کہ غالباً برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے خواجہ احمد دین صاحب مرحوم امرتسری اور مولانا حافظ اسلم صاحب جیراچپوری نے اس پر قلم اٹھایا۔

انیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول متحدہ ہندوستان میں مذہبی مناظروں کی گرم بازاری کا دور تھا۔ اور اسلام، عیسائیت اور ہندومت کے مختلف مسائل مثلاً وحی، کتب مقدسہ کی تحریف، تثلیث و

وحید، گوشت خوری، تناسخ وغیرہ ان مناظروں اور مباحثوں کا موضوع ہوتے تھے۔ امرتسر کے کچھ مسلمانوں نے اس قسم کے مباحثوں کے لئے ایک ”مجلس مباحثہ“ (Debating Club) کی بنیاد رکھی۔ اسی کلب میں ایک بحث کے دوران اسلامی قانون وراثت کے قابل اعتراض پہلو زیر غور آئے اور اس کے بعد خواجہ صاحب مرحوم نے ”معجزہ قرآن“ کے نام سے ایک رسالہ پہلی دفعہ ۱۹۱۴ء میں شائع کیا جس میں وراثت کے بعض دوسرے مسائل پر تنقید کے علاوہ یتیم پوتے کے محبوب الارث ہونے کے مسئلے کو بھی از روئے قرآن غلط ٹھہرایا گیا۔ اخبار ”اہل حدیث“ امرتسر کی ماہ مئی ۱۹۱۷ء (رجب ۱۳۳۵ھ) کی کچھ اشاعتوں میں اس رسالہ کی تردید میں کچھ مضمون چھپے اور اس طرح کافی عرصہ تک اس پر بحث کا سلسلہ چلتا رہا۔ اخبار ”اہل حدیث“ کے مضامین کے علاوہ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب اور مولوی نور محمد صاحب ہزاروی وغیرہ نے خواجہ صاحب کی تردید میں متعدد اشتہار شائع کئے۔ اسی طرح انجمن حفظ المسلمین امرتسر کی طرف سے مولوی نور احمد صاحب نے جواب الجواب میں مئی ۱۹۱۷ء، جون ۱۹۱۷ء، اگست ۱۹۱۷ء اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں چار ضمیمے شائع کئے۔ بعد میں خواجہ صاحب مرحوم کا رسالہ معجزہ قرآن مع ان چاروں ضمیموں کے --- رسالہ البیان (امرتسر) کے جون و جولائی ۱۹۳۱ء کے مجموعی خاص نمبر کی حیثیت سے ”الوراثت فی القرآن“ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

مولانا حافظ اسلم صاحب جیراچپوری نے خواجہ صاحب مرحوم کے مذکورہ رسالہ ”معجزہ قرآن“ کا ملخص عربی ترجمہ ”الوراثت فی الاسلام“ کے نام سے علی گڑھ سے شائع کیا اور بعد میں رسالہ ”معارف“ اعظم گڑھ کے جون و جولائی ۱۹۱۸ء کے نمبروں میں اپنا مقالہ ”محبوب الارث“ شائع کرایا۔ اس مقالہ کی اصل بنیاد خواجہ احمد الدین صاحب کی تحریریں ہی تھیں۔

۲۹ نومبر ۱۹۱۸ء کے پرچہ ”الہدیت“ میں حافظ ثناء اللہ صاحب مرحوم و مغفور امرتسری نے اس مقالہ کی تردید میں مضمون لکھا۔ جس کا جواب الجواب خواجہ صاحب نے دسمبر ۱۹۱۸ء میں اپنے مذکورہ بالا ضمیمہ چہارم میں دیا تھا۔۔۔۔۔ حال ہی میں مولانا جیراجپوری صاحب کا مذکورہ مقالہ ادارہ طلوع اسلام کراچی نے اپنے کتابچے موسوم بہ ”تین اہم مسائل“ میں شائع کیا ہے۔

اس تمام تفصیل سے ظاہر یہ کرنا مقصود ہے کہ اس طرح اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ ایک نیا نقطہ نظر پیدا ضرور ہو گیا تھا (۷) اگرچہ اسے چنداں اہمیت حاصل نہ ہوئی کیونکہ برطانوی ہند میں جن علاقوں میں قانون شرعی نفاذ پذیر تھا وہاں بھی قانوناً قرآن و سنت کی کوئی نئی اور متقدمین کے مخالف تعبیر درخور اعتنا نہیں سمجھی جاسکتی تھی (۸)۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں پنجاب میں شریعت ایکٹ

West Punjab Muslim personal Law (Shariat) Application

Act (IX of 1948) نافذ ہوا۔ عوام مدت دراز سے رواجی ہندو قانون سے مانوس و مالوف ہو چکے تھے اور اس رواجی قانون نے بہت سے دیگر عوامل کے ساتھ مل کر ایک خاص قسم کا معاشرتی و معاشی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ اسلامی قانون وراثت کی تفصیلات بہت سے دوسرے احکام اسلامی کی طرح اذہان و قلوب سے اوجھل ہو چکی تھیں اور لے دے کر عام لوگوں کو صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ اسلامی قانون وراثت میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی حصہ دیا جاتا ہے۔ اور صرف اتنی سی بات کا تدارک حیلہ جو طبائع کے لئے مشکل نہ تھا لیکن اب جو یہ قانون نافذ ہوا اور اس کے مختلف گوشے سامنے آئے تو کہیں حصہ دینا مکروہ نظر آنے لگا اور کہیں نہ دینا غیر معقول معلوم ہونے لگا۔ غیر اسلامی ذہنیوں کو اپنی بجائے اسلامی قانون وراثت میں ناہمواریاں دکھائی دینے لگیں۔ اسلام سے جہالت اور لاعلمی نے اس پر مزید اضافہ یہ کیا کہ یہ سمجھا

جانے لگا کہ جس طرح بیٹی کو کسی حیلہ سے اس کے حصہ سے محروم کرنا شرعی گنا ہے اسی طرح محبوب الارث کو بہہ وغیرہ کے ذریعے کچھ دینا بھی شرعاً ممنوع ہے۔ اور ستم پر ستم یہ ہوا کہ بعض غرض مندوں نے عوام کی اس جہالت اور لاعلمی کو خوب Exploit کیا اور مسئلہ اصولی سے زیادہ ذاتی بن کر رہ گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تحقیق حق و اصلاح احوال کی بجائے فتح و شکست کے نظریوں سے اس پر غور کیا جانے لگا۔ خصوصاً دسمبر ۱۹۵۳ء میں پنجاب اسمبلی میں زیر غور لائے جانے کے بعد سے تو یہ مسئلہ (Problem) کے بجائے مقابلہ (Test) کی شکل اختیار کر گیا۔

یہ تو اس مسئلہ کے پیدا ہونے اور شدت اختیار کرنے کے سماجی سیاسی اور تاریخی اسباب و حالات کے متعلق ضروری تفصیلات تھیں۔ اب ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی ان نئے دلائل اور اصول و قواعد سے بحث جن کی رو سے یتیم پوتا محبوب الارث نہیں ٹھہرتا۔



حواشی اور حوالہ جات

- ۱ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی نے اس مسئلہ پر جو پبلک آراء شائع کی ہیں اس میں بعض حضرات نے تو صاف قانون شریعت کو ہی سرے سے ناقابل تسلیم کہہ دیا ہے۔ دیکھئے (Opinions) کا صفحہ ۸۴
- ۲ تین اہم مسائل صفحہ ۱۶۱ نیز اسی کتاب کا صفحہ ۹-۷
- ۳ ایضاً صفحہ ۲۰۸
- ۴ تاریخ فقہ اسلامی صفحہ ۴۲۰
- ۵ کتاب الام شافعی ۷/۲۵۰
- ۶ تاریخ فقہ اسلامی صفحہ ۲۵۸ تا ۲۶۰
- ۷ ایک ”اہل علم“ کی زبانی معلوم ہوا کہ مشہور روسی عالم موسی جار اللہ نے اپنی کتاب ”صحيفة الفرائض“ میں اس مسئلہ پر کچھ لکھا ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود تلاش بسیار کے یہ کتاب کہیں سے دستیاب نہ ہو سکی اور نہ اس مصنف کے دلائل کا ”اہل علم ممدوح“ نے باوجود میرے خط لکھنے کے کچھ پتہ دیا۔۔۔ حالانکہ ان کے پاس کتاب مذکور بقول ان کے موجود تھی اور میں بوجہ بعد مسافت ان تک پہنچ نہ سکا۔
- ۸ ملا کا محمدن لاء (انگریزی) صفحہ ۲۷-۲۸ دفعات ۳۲-۳۶



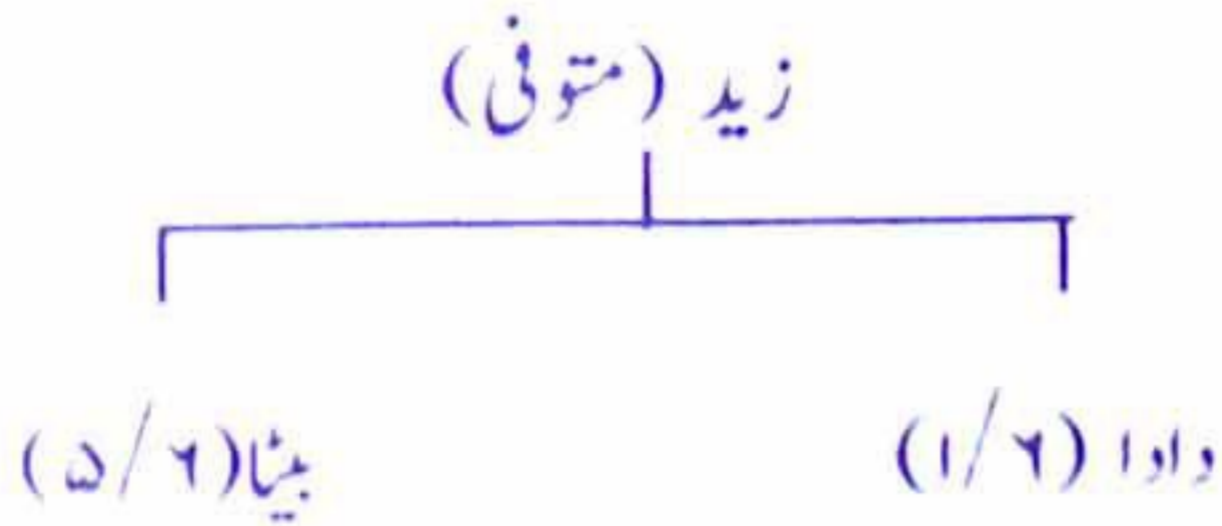
باب دوم

اجتہاد نو

فصل اول : پہلی دلیل

مجموعی طور پر اس مسئلہ پر جو جدید دلائل تحریر یا تقریر کے ذریعے عوام تک پہنچے ہیں۔ ان سے اس باب کی تین فصلوں میں بحث کی جائے گی۔ یہ دلائل حسب ذیل ہیں: (۱)

(۱) ”فقہاء سے اقرب کا مفہوم متعین کرنے میں غلطی ہو گئی ہے کیونکہ اگر اقرب کے معنی مطلقاً درجہ کے لحاظ سے قریب کے لئے جائیں تو وراثت کے بہت سے مسلمہ اور اجماعی مسائل ٹوٹ جاتے ہیں مثلاً نیچے کی مثال میں دادا کو بیٹے کی موجودگی میں بھی حصہ ملا ہے حالانکہ بیٹا بہ نسبت دادا کے میت کا اقرب ہے۔“



اسی طرح سے اور بھی قدم قدم پر اس پر اعتراض ہو سکتے ہیں لہذا قاعدہ الاقرب فالاقرب (جو تقسیم وراثت کا اصل اصول اور بنیادی قاعدہ ہے) میں اقرب کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ”اقرب وہ

رشتہ دار ہے جو بلا واسطہ مورث سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ لیکن بوقت وفات مورث کے وہ واسطہ موجود نہ ہو“ (۲)۔ اقرب کے یہی اور صرف یہی معنی لینے پر ہی یہ قاعدہ قانون وراثت میں ٹھیک طور پر چل سکتا ہے اور اس مفہوم کی رو سے یتیم پوتا بھی اپنے چچا سے محبوب نہیں ہو سکتا۔

یہ مختصر خلاصہ ہے مولانا جیراجپوری صاحب کے مقالہ ”محبوب الارث“ کا۔ اور قریب قریب یہی مفہوم خواجہ احمد الدین صاحب کے رسالہ ”الوراثۃ فی القرآن“ سے حاصل ہوتا ہے (۳)۔ اور اگرچہ مقالہ مذکورہ نہایت سنجیدہ اور علمی و فقہی انداز میں لکھا گیا ہے۔ لیکن بغائر مطالعہ کرنے سے اس میں چند غلط فہمیاں نظر آتی ہیں۔

اول تو قاعدہ الاقرب فالاقرب۔ جس پر انہوں نے اعتراضات قائم کئے ہیں۔ کسی کے نزدیک بھی فقہ فرائض کا اولیٰ بنیادی قاعدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اسی مقالہ کے حصہ اول کے باب دوم و سوم میں بیان ہو چکا ہے۔ سب سے مقدم کلیہ تقدیم ذوی الفروض کا ہے۔ اس کے بعد دوسرا کلیہ ”تقدیم بالجهة“ کا ہے (اور یہ دونوں کلیے اور ان کی ترتیب آیات میراث کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہو جاتی ہے)۔ اس کے بعد تیسرے درجہ پر قاعدہ الاقرب فالاقرب ہے۔ چونکہ پہلے دونوں کلیے مقدم ہیں۔ اسی لئے ان کا لحاظ رکھتے ہوئے فقہ اہل السنّت میں پہلو و رثاء کو ذوی الفروض اور عصبات میں تقسیم کیا گیا ہے اور قاعدہ مذکورہ اس کے بعد نافذ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح فقہ جعفری میں دونوں ابتدائی کلیوں کا لحاظ و رثاء کی طبقہ بندی میں کر لیا گیا ہے اور قاعدہ الاقرب فالاقرب اس کے بعد نافذ ہوتا ہے یعنی طبقوں پر نہیں بلکہ ذیلی اصناف پر۔

گویا فقہ حنفی ہو یا جعفری ہر دو کے نزدیک جہاں کہیں قاعدہ الاقرب فالاقرب پہلے دو کلیوں سے متصادم ہو گا تو اسے ترک کر دیا جائے گا دیکھئے

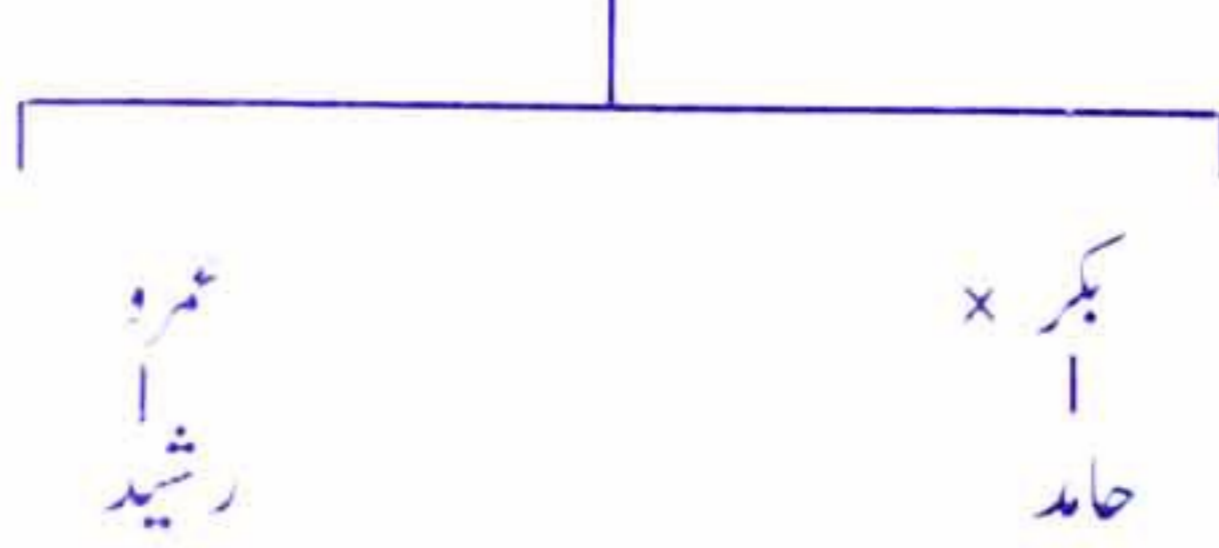
المراد غلط ہونے پر پیش کی ہیں وہ تمام کی تمام ایسی ہیں جن میں یا تو مختلف کلیات کا تصادم ہوتا ہے یا وہ اجماعی طور پر مسلمہ نہیں ہیں (۶) مثلاً ان کی دادا اور بیٹے کی مثال جو ابھی صفحہ ۷۳ پر بیان ہوئی ہے اس میں شیعہ کے نزدیک فی الواقع دادا کو کچھ نہیں ملتا۔۔۔۔۔ اسی طرح انہوں نے ”مسئلہ مشترکہ“ (۷) کی جو مثال دی ہے وہ بھی متنازعہ فیہ ہے۔ (احناف و شوافع کے درمیان) (۸) اور یہی حال باقی مثالوں کا ہے۔

اب ہم مولانا موصوف کے اقرب کے جدید مفہوم کو لیتے ہیں۔ بلاواسطہ رشتہ دار کے اقرب ہونے میں تو کسی کو بھی کلام نہیں۔ رہا بلاواسطہ رشتہ دار ہونا تو اس میں فقہاء کے نزدیک ”اقرب وہ ہے جو بلحاظ رشتہ میت سے زیادہ نزدیک ہو“ (من هو ادنی قرابته الی المیت منه) (۹)۔ صاف ظاہر ہے کہ جب بلاواسطہ رشتہ داروں میں سے زیادہ نزدیک کا رشتہ دار اقرب ہے تو بلاواسطہ رشتہ دار بلاواسطہ رشتہ دار کے مقابلے پر یقیناً اقرب ہی رہے گا اور اقربیت کا یہی مفہوم وراثت میں ہی نہیں نکاح وغیرہ امور میں بھی لیا جاتا ہے اور ولی نکاح کے بارے میں بھی الاقرب فالاقرب کا اصول استعمال ہوتا ہے (۱۰)۔۔۔۔۔ لیکن مولانا جیراچپوری صاحب کی تعریف کے مطابق درمیانی واسطہ کے اٹھ جانے سے بلاواسطہ اور بلاواسطہ رشتہ دار ایک ہی درجہ کے ہو جاتے ہیں گویا اس طرح کسی عورت کے بھائی کی موجودگی میں اس کا خرد سال یتیم بھتیجا اس کا (اپنی پھوپھی کا) نکاح کر کے دے سکتا ہے۔۔۔۔۔ خیر یہ نکاح کا معاملہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہمارا اصل مقصد احکام میراث میں اقرب کے اس نئے مفہوم کے مضمرات کا جائزہ لینا ہے۔

مولانا جیراچپوری صاحب اور ”طلوع اسلام“ کے نزدیک اس قاعدہ کا

اطلاق یوں ہو گا۔ دیکھئے مثال:

زید (متوفی)



(زید متوفی کی زندگی میں مرنے والوں کے نام کے ساتھ X کا نشان بنا دیا گیا ہے۔)

عمرو تو اقرب کی تعریف کے پہلے جزء (باواسطہ رشتہ دار ہونا) کے باعث اقرب ہے۔۔۔۔۔ حامد اقرب کی اس نئی تعریف کے دوسرے جزء (بوقت وفات مورث درمیانی واسطہ موجود نہ ہونا) کی بناء پر اقرب ہے۔ لہذا دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مرحوم بکر کا حصہ نکال کر حامد کو دیا جا رہا ہے۔ لیکن اول تو مولانا موصوف نے خود ہی اپنے مقالہ میں ایک جگہ وراثت کی ایک مثال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”لیکن ایک بدبخت یتیم پوتا ہی ہے جو اپنے باپ کی عدم موجودگی میں اس کی بجائے اپنے چچا کا بھائی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بست شکر بمستاں داد و پشمت سے بیخاراں

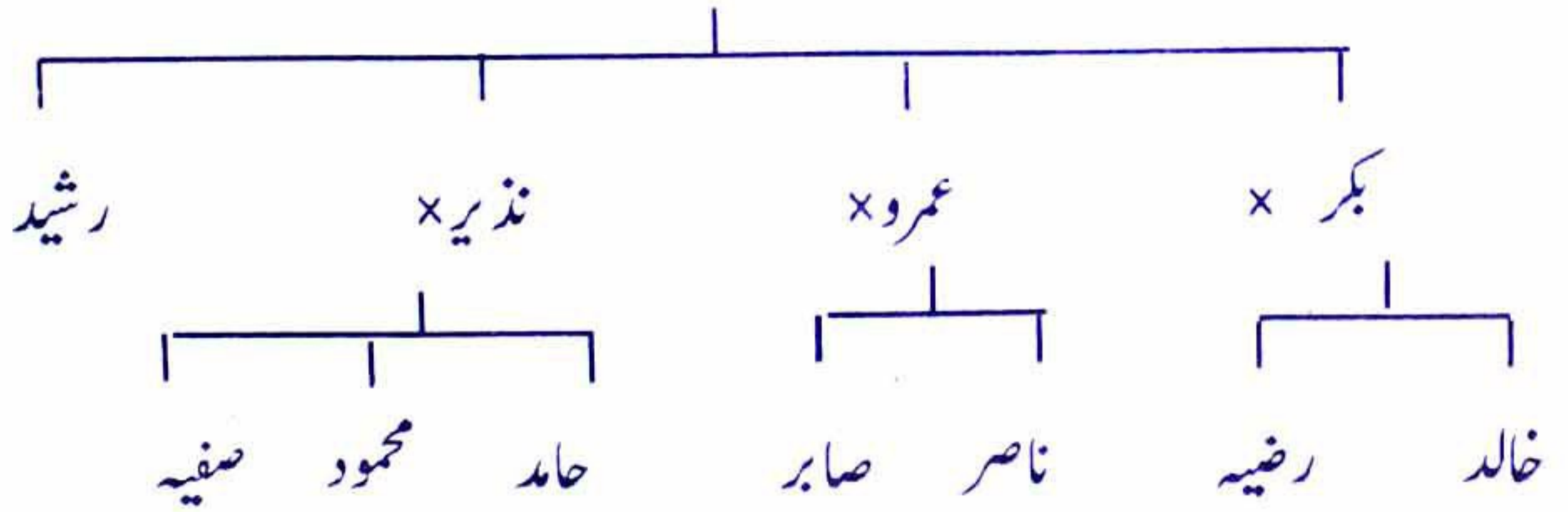
منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم (۱۱)“

۔۔۔۔۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا مقصد مردہ کا حصہ نکالنا نہیں بلکہ یتیم بھتیجے کو چچا کا بھائی بنا کر حصہ دلانا ہے اور اقربیت کا یہ نیا مفہوم بھی اسی بات کا متقاضی ہے۔ تاہم ”طلوع اسلام“ کی مندرجہ ذیل عبارت مزید وضاحت کر دیتی ہے۔ مندرجہ بالا مثال ہی کو سمجھانے کے بعد لکھا ہے۔۔۔۔۔ ”موردی صاحب فرماتے ہیں کہ تم زید کے مرنے پر اس کے فوت شدہ بیٹے بکر کا حصہ نکال کر حامد کو دیتے ہو یہ غلط ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ بکر کا حصہ کون

نکالتا ہے حصہ صرف اس کا ہوتا ہے جو متوفی کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو مردوں کے حصے کوئی نہیں نکالتا قرآن کی رو سے حامد اپنے دادا (زید) کے ترکے میں حقدار ہے اس لئے حامد کو خود اس کا حصہ ملتا ہے نہ کہ اس کے متوفی باپ بکر کا حصہ۔ اگر بکر کا حصہ نکلتا تو اس کی بیوہ کو بھی کچھ مل جاتا لیکن جب بکر کا حصہ ہی نہیں تو بیوہ یا بکر کے دوسرے رشتہ داروں کو کیا ملے گا؟ پھر سن رکھئے کہ حامد کو براہ راست (زید کے ترکے سے) اپنا حصہ ملتا ہے نہ کہ اپنے متوفی باپ (بکر) کا حصہ“ (۱۲)۔

بات تو واضح ہے کہ بھتیجے کو براہ راست یعنی چچا کا بھائی بنا کر حصہ ملے گا۔ لیکن اب دیکھئے کہ یہ ”نیا قرآنی نظریہ“ کس قدر مغالطے اپنے اندر مضمحل رکھتا ہے۔ اب تک ہمارے سامنے صرف ایک ایسی مثال تھی جس میں ایک چچا اور ایک یتیم بھتیجا موجود ہوں۔ اب چند نئی مثالیں لیجئے۔
مثال نمبر ۱

زید (متوفی)

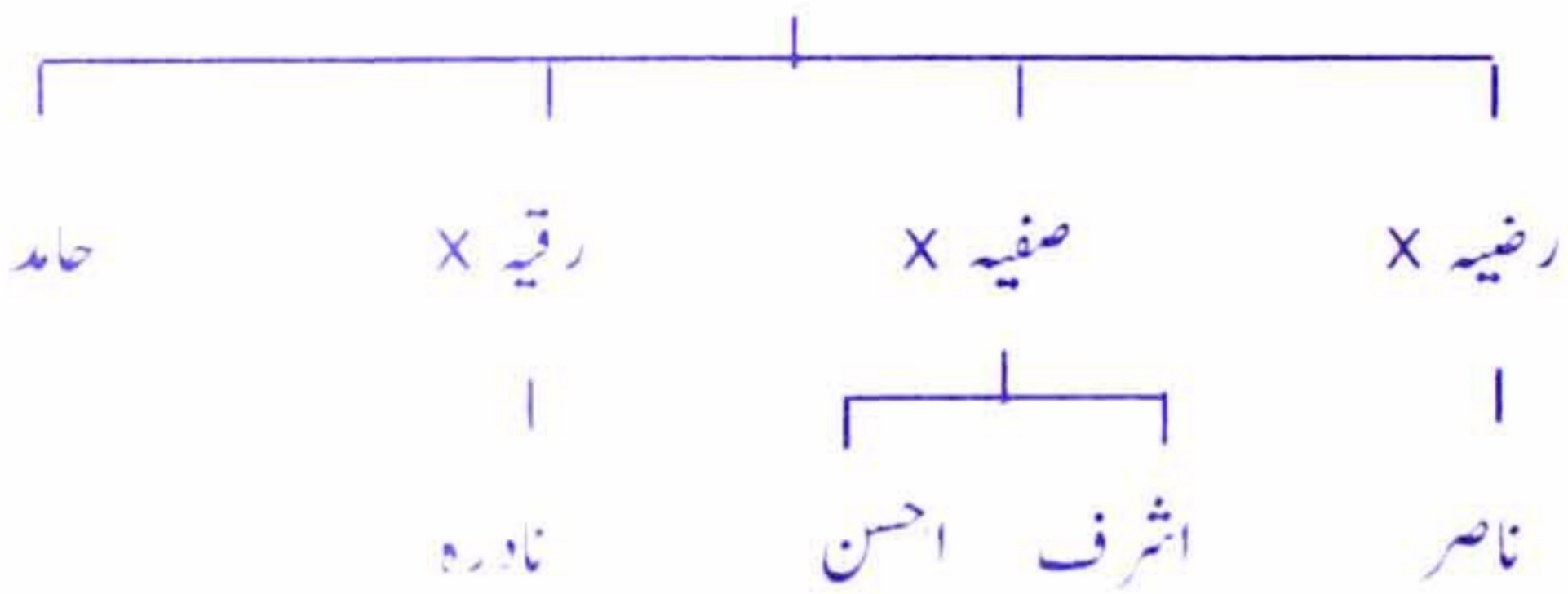


(زید متوفی کی زندگی میں مرنے والوں کے ناموں کے ساتھ x کا نشان ہے)۔ گویا اس مثال میں رشید کے سات بھتیجے اور بھتیجیاں اس کے بھائی بہن بن کر اس کے ساتھ زید (دادا) کی جائیداد سے حصہ پائیں گے کیونکہ درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے وہ رشید کے درجے کے اقرب بن گئے ہیں۔۔۔۔ اس طرح رشید کو کل جائیداد کا ۱/۷ حصہ ملے گا حالانکہ اگر اس کے بھائی زندہ ہوتے

جب بھی اسے $1/2$ ملتا۔ یہ کس بات کی سزا؟ کیا چچاؤں سے گزشتہ تیرہ سو برس کا بدلہ لینے کے لئے تو یہ فارمولا تیار نہیں کیا گیا؟

پھر اسی قاعدے کی رو سے بیٹیوں کی وفات کی صورت میں ان کی اولاد بھی اپنے ماموں کے ساتھ اقرب ہو کر نانا کی جائیداد سے حصہ پائے گی۔
مثال نمبر ۲

زید (متوفی)



(زید متوفی کی زندگی میں مرنے والوں کے ناموں کے ساتھ X کا نشان ہے)۔
اس مثال میں اس جدید اجتہاد کی رو سے حامد کی تینوں مرحوم بہنوں کی اولاد اس کے ساتھ بھائی بہن بن کر حصہ پائے گی اور اس طرح حامد کو جو بصورت دیگر کل جائیداد کا مالک ہوتا اس میں سے صرف $2/9$ حصہ ملے گا۔ حالانکہ اگر اس کی تینوں بہنیں زندہ ہوتیں جب بھی اسے $2/5$ حصہ ملتا۔ یہ تقسیم کیوں کر معقول ہو سکتی ہے جس میں اکلوتے بیٹے کے ہوتے ہوئے $1/9$ حصہ جائیداد دوسرے خاندان میں جا رہا ہے۔۔۔۔۔ خیال رہے کہ فقہ جعفری میں اگرچہ بیٹیوں کی اولاد کو بھی حصہ ملتا ہے اور پھوپھی اپنے یتیم بھتیجیوں کو بھی محبوب کر سکتی ہے لیکن موجودہ صورت مسئلہ میں ان کے نزدیک بھی تمام جائیداد حامد کی ہوگی۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں ذرا غور کریں تو یہ درمیانی واسطے کے اٹھ جانے پر نیچے اوپر سب کو ایک ہی درجہ دے دینے پر بعض دفعہ کسی اکلوتے

لڑکے کے ساتھ اس کے چچا زادوں کی اولاد بھی شامل ہو سکتی ہے۔ الغرض قانونی اور فقہی نقطہ نظر سے یہ فارمولا یا اصول کسی طرح بھی قابل عمل نہیں ہے سوائے اس صورت کے کہ مرنے والے بیٹے کا صرف ایک بیٹا ہی باقی رہ گیا ہو۔

مقام غور ہے کہ فقہائے متقدمین پر تو یہ الزام لگایا جاتا ہے --- اور وہ ایک حد تک بجا بھی کہا جا سکتا ہے --- کہ وہ اکثر مسائل کی ناممکن الوقوع اور شاذو نادر صورتوں پر بھی غور کر کے ان کے جوابات کتابوں میں لکھتے ہیں اور اس ذہنی عیاشی سے سوائے فکری انتشار کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا --- لیکن کم از کم یہ عادت کسی قائم کردہ کلیہ کے تمام ممکن اثرات سے تو آگاہ کرتی ہے --- کیا صرف ایک مثال سامنے رکھ کر کوئی نیا قاعدہ یا اصول بنا دینا جو دو قدم بھی آگے نہ چل سکے --- یہ اس علمی ہیضہ سے زیادہ خطرناک نہیں ہے ؟

فصل دوم : اصول قائم مقامی پر بحث

نئے مکتب خیال کے مفکرین کی طرف سے اس مسئلہ پر ایک اور ”قرآنی دلیل“ یہ پیش کی جاتی ہے کہ

”آیہ مبارکہ یوصیکم اللہ فی اولادکم میں اولاد سے مراد صرف بیٹے بیٹیاں ہی نہیں بلکہ ان کی اولاد اور اولاد در اولاد سب اس میں شامل ہیں اور اس بات کے خود تمام مفسرین و فقہاء بھی قائل ہیں۔ تو جس طرح بحکم آیہ مبارکہ ”حرمت علیکم امہاتکم“ ماں کے علاوہ نانی، دادی اور اوپر تک تمام بچیوں کی حرمت بہ نص قرآن آ جاتی ہے اسی طرح آیہ مبارکہ ”یوصیکم اللہ فی اولادکم“ سے اولاد الاولاد کا حق وراثت بنص ثابت ہے اور جب فقہاء میں سے کوئی بھی ولد الولد کا اولد کا منکر نہیں ہے تو ولد

(بیٹے) کی عدم موجودگی میں ولد الولد (پوتا) اس کا قائم مقام سمجھا جائے گا اور قرآن نے جو حصہ ولد کے لئے مقرر کیا ہے وہ اسے ملے گا۔ (۱۳)

مطلق اولاد الاولاد کا حق وراثت تو واقعی بالنص ثابت ہے۔ لیکن یہ ”مفکرین قرآن“ کا نیا انکشاف نہیں ہے۔ اس کا جب منکر ہی کوئی نہیں تو ثابت کرنے کا کیا مطلب! دیکھئے جب کسی آدمی کے صرف پوتے موجود ہوں تو کوئی بھی انہیں یہ کہہ کر محروم نہیں کرتا کہ یہ تو پوتے ہیں بیٹے نہیں۔۔۔۔۔ اسی طرح ولد الولد کالولد کا بھی کسی نے انکار نہیں کیا البتہ اس میں اتنا اختلاف ضرور ہے کہ شیعہ کے نزدیک بیٹی کی اولاد بھی اولاد شمار ہوتی ہے اور اہل سنت کے نزدیک بیٹی کی اولاد گو مجازاً اولاد ہی ہے لیکن حقیقتاً وہ کسی دوسرے کی اولاد ہے اس لئے وراثت میں صرف بیٹے کی اولاد۔ اولاد شمار ہو گی۔ اگر چہ بیٹوں کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیٹیوں کی اولاد بھی اپنے موقع پر وراثت کی حقدار تصور کی جاتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہاں جس ولد الولد (یتیم پوتے) کی بحث ہو رہی ہے اس کے متعلق تو کسی کو اختلاف نہیں ہے۔۔۔۔۔ اولاد الاولاد کا اولاد ہونا تو ایسی بدیہی سی بات ہے کہ اس کا انکار نہ کرنا یہ اس کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل پیش کرنا شاید خلل دماغ سمجھا جائے۔

بات دراصل ولد کی عدم موجودگی میں ولد الولد کی حیثیت قائم مقامی کی ہے اور اسی تو یہ سب مشکل پڑ رہی ہے لہذا اب یہاں اسلامی قانون وراثت میں نظریہ قائم مقامی (Representation) پر بحث کرنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ”یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ“ میں اصل مرکزی نقطہ یہی اصول قائم مقامی ہے۔ اگر اسلامی قانون وراثت میں اس نظریہ کو جگہ دی جا سکتی ہے تو پھر مسئلہ صاف ہے اور اگر اس قانون میں اصول نیابت کے لئے جگہ نہیں تو پھر یتیم پوتے کا حق وراثت کی طرف سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ مولانا جیراجپوری صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے۔۔۔۔۔ ”حق یہ ہے

کہ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ فقہاء نے اس مسئلہ میں اسی اصل نکتہ یعنی قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا جس کی وجہ سے ایسی عظیم الشان غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ یتیم بچوں کو محبوب کرنے لگے۔ (۱۴)

لیکن نظریہ قائم مقامی صرف زمانہ حال کا کوئی علمی انکشاف نہیں ہے بلکہ یہ اصول ہر زمانے کے اسلامی فقہاء کے سامنے موجود تھا۔ لیکن سب نے ہی اسے نظر انداز کیا (۱۵)۔ اور دانستہ ایسا کیا اور کسی بھی مکتب خیال کے قانون دانوں (فقہاء) نے اسے بطور قاعدہ کلیہ تسلیم نہ کیا۔۔۔۔۔ آخر اس کی وجہ؟ افسوس ہے کہ اس کیوں کا جواب کہیں نہیں دیا گیا۔ حال ہی میں ایک مصری فاضل نے اپنی کتاب ”المقارنات التشريعیہ“ میں اس پر بحث کے لئے ایک صفحہ وقف کیا ہے۔ لیکن یہ بھی نہایت تشنہ ناکمل اور غیر واضح بحث ہے (۱۶)۔ اس لئے مزید وضاحت ضروری ہے (۱۷) فنتوکل علی اللہ :

وراثت میں قائم مقامی کے دو ہی پہلو ہو سکتے ہیں:

(۱) نوعی قائم مقامی یعنی شخص متوفی کے وارث یا وارثوں میں سے ہر ایک کو اس کی جگہ رکھ کر اسے وہی درجہ دیا جائے جو شخص متوفی کا تھا۔

(۲) انفرادی یا شخصی قائم مقامی یعنی شخص متوفی کا حصہ نکال کر اس کے ہونے والے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

پہلی قسم کی قائم مقامی اسلامی قانون وراثت میں نہایت محدود طریقے پر ممکن العمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے چھ اصلی وارثوں (بیٹا۔ بیٹی۔ ماں۔ باپ۔ خاوند۔ بیوی) میں سے جو بھی ہو گا اسے لازماً حصہ ملے گا۔ اب ان میں سے کسی کے نہ ہونے پر اس کے قائم مقام کا سوال پیدا ہوتا ہے تو خاوند اور بیوی کا تو قائم مقام کوئی ہو نہیں سکتا۔ باپ اور ماں کا قائم مقام البتہ ایک ہی ایک شخص ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی میں باپ کی عدم

موجودگی میں دادا بحیثیت باپ کے حصہ پاتا ہے۔ اور ماں کی عدم موجودگی میں نانی وہی ماں کا حصہ پاتی ہے۔۔۔۔ بیٹے بیٹی کے قائم مقام متعدد ہو سکتے ہیں لہذا ان میں یہ قائم مقامی چل ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر بیٹے بیٹی کے تمام قائم مقاموں کو اپنے سے اوپر کے درجے کے بیٹے کی طرح سمجھ لیا جائے تو جو نتیجہ نکلے گا اس سے ہم ابھی گذشتہ فصل میں بحث کر چکے ہیں (۱۸)۔

دوسری قسم کی قائم مقامی اسلامی احکام وراثت کے لئے سراسر اجنبی اور ناسازگار ہے۔ یہ قائم مقامی ان تمام نظامہائے وراثت میں تو چل سکتی ہے جہاں اولاد کے ہوتے ہوئے باقی کسی وارث کا حق وراثت تسلیم نہ کیا جاتا ہو مثلاً ہندو رواجی قانون۔۔۔۔ یا فرانسیسی قانون (۱۹) کیونکہ اس صورت میں اولاد میں سے جو مر گیا آخر اس کا وارث صرف اس کی اولاد نے ہی ہونا تھا لہذا وہی حصہ آگے تقسیم کر دیا جائے گا لیکن اسلامی قانون وراثت اولاد والدین اور زوجین کو بیک وقت لازماً وارث بناتا ہے (۲۰)۔ اور مقدم الذکر ہر دو وجہت کے نہ ہونے پر بھائی بہن زوجین کے ساتھ حصہ پاتے ہیں۔ گویا ہر حالت میں بیک وقت متعدد قسم کے وارث حقدار وراثت ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک قسم کو نظر انداز کرنا صریحاً قرآن کی خلاف ورزی ہے۔ لہذا قائم مقامی میں بھی ان تمام قسم کے وارثوں کی قائم مقامی کا سوال درپیش آئے گا۔ اب اگر ان تمام قسم کے وارثوں کے ”ہونے والے وارثوں“ کا حق قائم مقامی تسلیم کیا جائے تو گویا ان چھ قسموں میں سے ہر ایک قسم کے لئے آگے پانچ پانچ قسم کے جانشینوں کو تو حق قائم مقامی دینا ضروری ہو گا۔ اس طرح سے ہر ایک ایک واسطے سے کسی شخص متوفی کے ممکن قائم مقام تیس قسم کے وارث ہو سکتے ہیں اور پھر عین ممکن ہے کہ یہ ”ہونے والے وارث“ (قائم مقام) خود مر کر اپنے اور ”ہونے والے وارث“ (قائم مقام) پہنچ چکے ہوں تو اندازہ لگائیے کہ اس طرح ”ہونے والے وارثوں“ کی تعیین محالات سے نہیں

ہے؟ اگر تو یہ ہونے والے وارثوں کا سلسلہ صرف ایک طرف یعنی اولاد سے ہوتا تو بات آسان تھی۔ لیکن قرآنی نظام وراثت میں ایک عورت اپنے خاوند سے بحیثیت بیوی کے، اپنے بیٹے سے بحیثیت ماں کے، اپنے باپ سے بحیثیت بیٹی کے، تو لازماً ہی حصہ لے گی اور بعض دفعہ بھائی سے بحیثیت بہن کے یا اور متعدد صورتوں میں کسی کی وارث بن سکتی ہے۔ اس لئے کسی مردہ کا حصہ نکال کر اس کے ہونے والے وارثوں میں تقسیم کرنا اسلامی قانون وراثت کے لئے بالکل ناممکن العمل ہے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اسلامی قانون وراثت میں یہ بھی عین ممکن بلکہ کثیر الوقوع ہے کہ ایک مرنے والے کے قائم مقام ہونے والے وارث بھی وہی ہوں جو اس کی غیر موجودگی میں وارث ہو رہے ہیں۔ اس صورت میں بھی قائم مقامی کے اس اصول کی لغویت ظاہر ہے (۲۱)۔

☆ اب اس بحث کے بعد ہم دوبارہ اس دلیل کی طرف آتے ہیں کہ چونکہ ”اولاد کم“ میں اولاد الاولاد بھی شامل ہے۔ اس لئے پوتوں کو بیٹوں کا قائم مقام بنا کر حصہ کیوں نہ دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس قائم مقامی کی وہی دو صورتیں ممکن ہیں یا تو سب پوتوں پوتیوں کو بیٹے بیٹیاں یعنی چچا یا چچاؤں کے بھائی بہن سمجھ کر حصہ دیا جائے۔ اس نظریہ کی غلطی ابھی گذشتہ فصل میں ظاہر ہو چکی ہے (۲۲)۔ اب رہی دوسری صورت کہ اس کے مردہ باپ کا حصہ نکال کر اس کے ہونے والے وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔ یہ ایسا نظریہ ہے کہ کوئی فہم القرآن سے بالکل عاری انسان ہی اس کا تصور کر سکتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام نے بھی (جس کی رائے عموماً فکر قرآنی پر ہی مبنی ہوتی ہے) تصریح کر دی ہے کہ ”مردوں کے حصے نہیں نکالے جایا کرتے“ (۲۳)۔۔۔۔۔ آئیے اب اس کی قباحتوں اور پیچیدگیوں پر مزید غور کریں۔

☆ اول تو جب مردوں کے حصے نکالنا ہیں تو چھ اصلی وارثوں میں سے

ہر ایک کا حصہ نکالنا چاہیے۔ قائم مقامی ہو تو سب کے لئے ہو یا پھر کسی کے لئے نہ ہو۔ لیکن اگر قرآنی احکام کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ یہ حق (قائم مقامی) صرف اولاد ہی کو دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ تو پھر اس میں بھی صرف یتیم پوتے ہی کے باپ کی کیا خصوصیت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی کی جس قدر اولاد اس کی زندگی میں فوت ہوئی ہے سب کے حصے نہ نکالے جائیں؟ شاید یہ کہا جائے کہ ان کا تو وارث ہی باقی کوئی نہیں جو مدعی ہو (۲۴) لیکن اگر آپ قرآن کے احکام سے واقف ہیں تو آپ ہر گز ایسا نہیں کہہ سکتے۔ کیا ان کی ماں اور ان کے بقایا بھائی بہن ان کے وارث نہیں ہیں؟ اور اگر وہ (مرنے والے) زندہ رہتے اور باپ کی وراثت سے حصہ پانے کے بعد مرتے تو کیا یہی ان کے وارث نہ ہوتے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے احکام وراثت کی رو سے کسی آدمی کا بالکل الاوارث ہونا محالات سے ہے (۲۵)۔ اور اس کی مثالیں شاید ایک فی لاکھ بھی مشکل سے ملیں۔۔۔۔۔ اور قرآن کے احکام میراث اس لحاظ سے جس رحمت پر مبنی ہیں۔ اس کے تصور سے روح وجد میں آ جاتی ہے۔

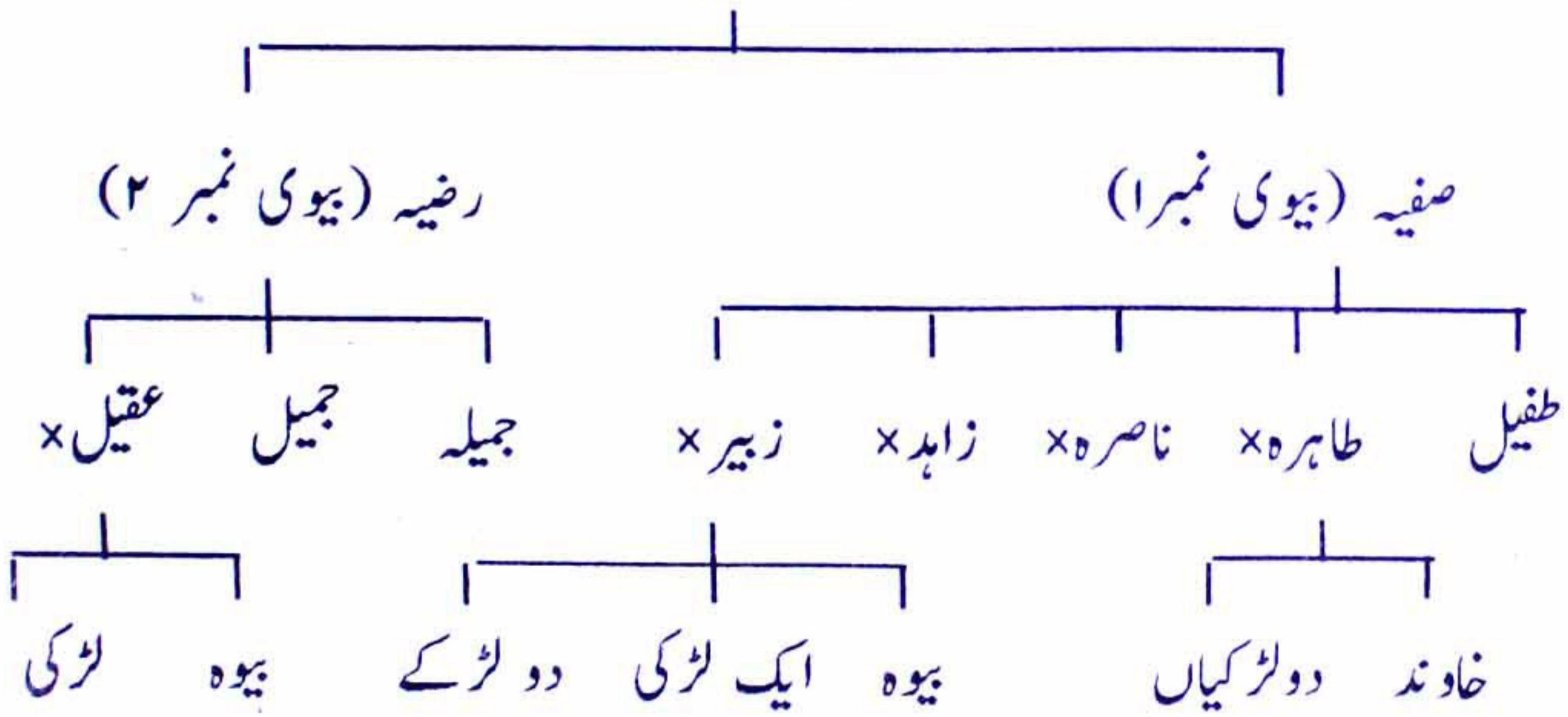
آپ جب بھی کسی مرنے والے کا حصہ نکال کر اس کے وارثوں میں تقسیم کریں گے تو آپ اس کی اولاد کے علاوہ اس کے ماں باپ اس کی بیوی اس کے خاوند میں سے کسی ایک کو بھی (موجود ہوتے ہوئے) قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ورنہ یہ قرآنی احکام کی ایسی صورتِ خلاف ورزی ہو گی جس میں ہر گز کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ مردہ بیٹوں سے نئے میں ان کی بیواؤں کو اور مردہ بیٹیوں کے حصے میں ان کے خاوندوں کو آخر ہی طرح وراثت سے محروم کیا جا سکتا ہے؟ (۲۶)

اور اگر یہ تسلیم ہے کہ قائم مقامی کا یہ اصول ان میں جاری یا جائے کہ ”مرنے والوں کا حصہ نکال کر آگے ان کے موجودہ وارثوں میں

تقسیم کیا جائے۔۔۔۔۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ واضح قرآنی احکام ترک کئے بغیر اس پر عمل ناممکن ہو گا۔ بلکہ اس قانونی اور حسابی دلدل میں گھسنے سے جو عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو گی اسے دیکھ کر آپ خود چلا اٹھیں گے۔ اس صورت میں بعض دفعہ بیوہ بہوؤں کو صلبی بیٹے یا بیٹی کے مقابلے پر زیادہ حصہ ملے گا۔ اور بعض اوقات مردہ بیٹیوں کے خاوند اور ان کی اولاد، زندہ صلبی بیٹوں اور بیٹیوں سے بھی زیادہ لے جائیں گے اور اکثر دفعہ لائیکل قسم کی حسابی صورتیں پیدا ہو جائیں گی (۲۷)۔

صرف ایک مثال لیجئے۔ زید مرتا ہے اور اپنے پیچھے اپنی دو بیویاں رضیہ اور صفیہ اور ان سے کچھ اولاد اور کچھ اولاد کے وارث چھوڑتا ہے جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے۔

زید (متوفی)



(زید متوفی کی زندگی میں مرنے والوں کے ناموں کے ساتھ x کا نشان ہے)۔
 ذرا اس اصول قائم مقامی کی بناء پر زید کی جائیداد تقسیم کر دکھائیے۔
 اور یہ کچھ ایسی نادر الوقوع مثال بھی نہیں ہے۔ (اور چلو یہ بھی فرض کر لیجئے
 کہ سب مرنے والے ایک ہی وقت میں مر گئے۔ کیونکہ اول تو اگر موت کی
 ترتیب کا بھی خیال کیا جائے تو ہر بعد میں مرنے والے کو سابق کی وراثت

سے حسب قواعد حصہ ملنا چاہئے۔ لیکن اس طرح بات اور بھی گورکھ دھندا بن جائے گی۔ لیکن اس مفروضہ کے بعد بھی مندرجہ بالا اصول قائم رہتی یعنی ”مردہ کا حصہ اس کے وارثوں میں تقسیم کرنا“۔۔۔۔ کی بناء پر تقسیم ترکہ آسان کام نہیں ہے) (۲۸)۔

خیال رہے کہ ”قدیم‘ بوسیدہ‘ پیچیدہ اور دنیا کے مشکل ترین“ (۲۹) قانون وراثت کے مطابق یہ چند سیکنڈ میں حل ہو جانے والا مسئلہ ہے۔
فقہ حنفی اور جعفری ہر دو کی رو سے صفیہ اور رضیہ ہر دو کا حصہ $1/8 =$ طفیل $= 1/8$ کا $2/5 = 2/20 = 1/10$ جمیل اور ان کی بہن جمیلہ $= 1/20$ ۔

لیکن اصول قائم مقامی کو لیتے ہوئے پہلے تو جائیداد کا $1/8$ حصہ اور رضیہ میں تقسیم ہو گا اور باقی $1/8$ زید متوفی کی کل اولاد (چھ لڑکوں اور دو لڑکیوں) میں مرد کو عورت سے دگنا کے اصول پر تقسیم ہو گا۔ اس کے بعد طاہرہ کا حصہ اس کے خاوند، ماں اور لڑکیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ نانہ کا حصہ اس کی ماں صفیہ اور بھائی بہنوں (طفیل، جمیلہ اور جمیل) میں تقسیم ہو گا یا شیعہ طریقہ کے مطابق صرف صفیہ ہی اس کا سارا حصہ لے گی۔۔۔۔ اسی طرح باقی مردوں یعنی زاہد، زبیر اور عقیل کے حصوں کا حال ہو گا۔ ایک اچھا ریاضی دان بھی جسے حصوں وغیرہ کی شرعی تقسیم بتا دی جائے تو بھی اس صورت مسئلہ کے حل اور جواب کے لئے ضرب و تقسیم کے پیچیدہ عمل سے خاصی دیر کے بعد ہی عہدہ برآ ہو سکے گا۔ اور پھر اس تقسیم میں جو نامقولیت ہو گی وہ الگ۔ مثال کے طور پر اس طرح تقسیم کرنے سے اسی موجودہ مثال میں صفیہ کل کا $1/28$ حصہ پائے گی اور زبیر کی لڑکی کو $23/920$ اور اس کے ہر لڑکے کو $23/280$ حصہ ملے گا اور پورے حسابی عمل کے لئے شاید دو صفحے بھی کافی نہ ہو سکیں۔

فصل سوم: متجددین کے بقایا دلائل

یتیم پوتے کا حق وراثت اس کا حق قائم مقامی تسلیم کرنے پر منحصر ہے۔ اور قائم مقامی کو دو صورتوں پر مبنی دونوں نئی دلیلوں سے ہم گذشتہ دو فصلوں میں پوری بحث کر چکے ہیں۔ نئے نقطہ نظر کے حامی حضرات کے بقایا تمام دلائل یا اعتراضات دراصل انہیں دو گذشتہ دلیلوں کی ذیل میں آجاتے ہیں۔ اس لئے ان سب کا بیان اس ایک فصل میں کیا جاتا ہے۔

(۱) چچا کی موجودگی میں یتیم بھتیجے (پوتے) کے محبوب الارث نہ ہونے پر جدید خیال حضرات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب فقہاء باپ کی عدم موجودگی میں دادا کو باپ کا قائم مقام بنا کر حصہ دلاتے ہیں تو اسی قاعدے کی رو سے یتیم پوتے کو اس کے باپ کا قائم مقام بنا کر کیوں وارث نہیں بنایا جا سکتا؟

غالباً یہی بظاہر سب سے بڑی منطقی اور معقول دلیل ہے جس کا اس مسئلے کے سلسلے میں سب سے زیادہ اعادہ کیا گیا ہے خواجہ احمد الدین مرحوم، مولانا جیراچپوری صاحب اور طلوع اسلام نے بھی جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ (بلکہ غالباً اقرب کی نئی تعریف کا محرک بھی یہی دلیل ہے)۔۔۔۔ اور دسمبر ۱۹۵۳ء کے بعد سے جب یہ مسئلہ اخبارات میں موضوع بحث بنا تو پبلک کے خطوط میں بھی اسی کو بار بار دہرایا جاتا رہا اور شاید اسی دلیل نے بعض حضرات کو وراثت کے کچھ نئے فقہی اصول مرتب کرنے پر بھی آمادہ کیا جن کا ذکر ابھی اس کے بعد کیا جائے گا۔

قائم مقامی کے اصول پر مہلصل بحث کے بعد ان مغالطوں کا تجزیہ دشوار نہیں ہے جو یہ دلیل اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ بات واضح ہے کہ اصول قائم مقامی اصول و فروع میں یکساں نہیں چل سکتا۔ ایک شخص کے باپ

یا دادے متعدد نہیں ہو سکتے۔ باپ کے مرنے پر دادا باپ کے درجہ پر رکھا جائے گا اور وہی حصہ ملے گا جو باپ بیٹا۔۔۔۔۔ لیکن یتیم پوتے متعدد ہو سکتے ہیں اور اگر اسی اصول پر ہر ایک پوتے کو بیٹا بنا دیا جائے تو جو نتیجہ ہو گا اس سے ہم پہلے بحث کر ہی چکے ہیں (۳۱)۔

(۲) اس سلسلے میں مفکرین تجدد کی طرف سے وراثت کا ایک نیا اصول یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ دو افراد میں سے زندہ پہلے مرنے والے کا وارث ہوگا یا دونوں ہی کسی حالت میں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے (۳۲)۔ یعنی وراثت صرف دو ایسے شخصوں میں جاری ہو سکتی ہے جن میں سے اگر ایک فوت ہو جائے تو دوسرا اس کا وارث بنے گا۔ مثلاً باپ اور بیٹا، بیوی اور خاوند وغیرہ کہ ایک کے مرنے پر دوسرا اس کا وارث ہوتا ہے اور جہاں ایسی بالمتقابل وراثت کی صورت نہ ہو وہاں وراثت جاری نہیں ہوگی مثلاً ماموں بھانجا وغیرہ کہ ایک کے مرنے پر دوسرا اس کا وارث نہیں بن سکتا۔۔۔۔۔ پس دادا و پوتے میں بھی صرف ایک طرف سے وراثت جاری کرنا غلط ہے یا تو دونوں طرف سے بند کیجئے یا دونوں طرف احکام وراثت جاری ہوں۔ یہ کیا مطلب کہ دادا تو پوتے کا وارث لیکن پوتا دادے کی وراثت سے محروم؟

دادا پوتے کی بالمتقابل وراثت پر ہم پہلے لکھ چکے ہیں البتہ یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ فاضل مفکر کو قرآن سے اصل اصول وراثت سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ قرآن کا یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ وراثت صرف وہیں ہوگی جہاں دونوں طرف سے وارث بن سکنے کی اہلیت موجود ہو۔۔۔۔۔ دیکھئے ایک بے اولاد بھائی کے مرنے پر دوسرا بھائی (جو صاحب اولاد بھی ہے) اس کا وارث بن سکتا ہے لیکن اسی صاحب اولاد بھائی کے مرنے پر وہ بے اولاد بھائی اس کا وارث نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی اپنی اولاد وارث ہوگی۔

(۳) چچا کے اپنے یتیم بھتیجے کو محبوب نہ کر سکنے کے حق میں ایک نئی دلیل یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ ”پوتے“ کا تعلق دادا سے اپنے باپ کے ذریعے سے ہوتا ہے نہ کہ چچا کے ذریعے سے اور جب چچا کی موت سے مورث بنانے کا سبب نہیں ہے تو اس کی موجودگی بھتیجے کی محرومیت کا سبب بھی نہیں بن سکتی (۳۳)۔ یتیم بھتیجا اپنے چچا کا بیٹا نہیں بن جاتا، کہ اس وجہ سے محروم کیا جائے ورنہ پھر اس پر اپنے چچا کی بیٹیاں بھی (بہنیں ہو کر) حرام ہو جانی چاہئیں۔ حالانکہ اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں ہے تو پھر چچا سے کس طرح وراثت سے روک سکتا ہے؟“

یہ خلط مبحث ہے۔ چچا کے اپنے بیٹے اس کی زندگی کی وجہ سے محبوب ہیں اور یتیم بھتیجا اپنے باپ کے قائم مقام نہ بنائے جا سکنے کے باعث۔ ورنہ یہ تو کوئی نہیں کہتا کہ وہ اپنے چچا کا بیٹا بن جاتا ہے۔ لہذا یہ ”نئی دلیل“ ایک مناظرانہ مغالطہ سے زیادہ نہیں ہے۔

(۴) سب سے بڑی اور عامیانہ دلیل جدید ”مفکرین“ حضرات اور معترضین کی طرف سے یہ پیش کی جاتی ہے کہ ”یہ جذبہ رحم و شفقت کے منافی ہے کہ بے آسرا یتیم کو اس جائیداد سے بھی محروم کر دیا جائے جو اس کے باپ کے زندہ رہنے کی صورت میں اسے ضرور ملتی۔“ (اس جذبہ رحم کی حقیقت کے لئے ایک دفعہ دیکھ لیجئے اسی حصہ دوم میں باب اول میں ”پس منظر“)

اگرچہ اسلامی قانون وراثت کی چند اصطلاحی (Technical) پیچیدگیوں کی وجہ سے یتیم پوتا اپنے چچا کی موجودگی میں وراثت سے حصہ نہیں پاسکتا (۳۴) لیکن قرآن نے یہ کب کہا ہے کہ ”اے دادو! خبداں اپنے یتیم پوتوں کو کچھ نہ دینا“۔۔۔۔۔ قرآن کریم تو اجازت بلکہ حکم دیتا ہے (جیسا کہ ہم اگلے باب میں بیان کریں گے) کہ ایسی صورتوں میں تمہیں اس کے ممکن حصے سے بھی زیادہ دے دینے کا اختیار حاصل ہے مثلاً دیکھئے اگر کسی آدمی کا ایک بیٹا کسی اعلیٰ

عہدے پر فائز ہو یا امیر کبیر ہو اور ایک خرد سال یتیم پوتا ہو اور وہ آدمی اپنی جائیداد کا بیشتر حصہ اس پوتے کو بطور بیہ دے دے تو اسلام کی نظر میں یہ فعل ناروا نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ چاہے وہ جائیداد دادا کی خود مکسوپہ ہو یا موروثی --- حالانکہ ہمارے موجودہ قانون کی رو سے موروثی جائیداد میں دادا کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس بارے میں اصل قابل غور نکتہ یہ ہے کہ قرآنی قانون وراثت جن اجتماعی مصالح و حکم (مثلاً اصول دوران دولت وغیرہ) پر مبنی ہے۔ ان کو ایک انفرادی مصلحت پر قربان کر کے سارے قانون کے ڈھانچے کو بگاڑ دینا ظلم اور نادانی کی انتہا ہوگی خصوصاً جب کہ ایسی انفرادی مصلحتوں کے لئے قرآن خود گنجائش ہی نہیں پیدا کرتا بلکہ ان کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یتامی کے بارے میں خاص حالات میں خاص خاص قسم کے مصالح اور مراعات کی حفاظت مطلوب ہوتی ہے جنہیں پورا کرنے سے قانون کی کلیت اکثر قاصر رہتی ہے۔ ان انفرادی مصالح و مراعات کے تحفظ کے لئے قرآن نے کیا احکام دیئے ہیں۔ ان سے اگلے باب میں بحث ہوگی۔

حواشی اور حوالہ جات

- ۱- یہ دلائل اور اعتراضات مختلف طریقوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ کچھ تو اس موضوع پر دستیاب لٹریچر سے جس کا ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ کچھ اخبارات میں اسی موضوع پر شائع ہونے والے خطوط سے اور کچھ پرائیویٹ بحث و مباحثہ کے دوران سنے گئے۔
- ۲- تین اہم مسائل صفحہ ۱۸۹
- ۳- الوراثۃ فی القرآن صفحہ ۳۸-۴۰، صفحہ ۱۲۲، ۱۲۵ نیز صفحہ ۱۳۵
- ۴- دیکھئے کتاب ہذا صفحہ ۱۳-۱۴ جزو (ہ) اور صفحہ ۱۸
- ۵- تین اہم مسائل صفحہ ۱۹۱
- ۶- یعنی مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک
- ۷- اسے مسئلہ عمریہ اور حجریہ بھی کہتے ہیں اور ان خاص پیچیدہ مسائل میں سے ہے جو "الملقبات" کے نام سے کتب فرائض میں بطور خاص ذکر کئے جاتے ہیں۔
- ۸- صورت مسئلہ اور کیفیت اختلاف کے لئے دیکھئے المواریث الاسلامیہ صفحہ ۴۴
- ۹- احکام المواریث صفحہ ۱۵۴ (مولانا خیراجپوری صاحب کی تعریف "اقرب" مقالہ کے صفحہ ۷۵-۷۶ پر پھر ایک دفعہ دیکھ لیجئے)۔
- ۱۰- احکام القرآن للجصاص ۵۰/۲
- ۱۱- تین اہم مسائل صفحہ ۱۵۸
- ۱۲- تین اہم مسائل صفحہ ۱۵۶-۱۵۷
- ۱۳- خواجہ احمد الدین مرحوم نے "الوراثۃ فی القرآن" میں متعدد جگہوں پر مختلف طریقوں سے اسی بات کو بیان کیا ہے --- یہ الفاظ (اقتباس) خواجہ صاحب مرحوم کے فرزند ڈاکٹر خواجہ سناء اللہ صاحب کے خط سے لئے گئے ہیں۔ جو انہوں نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا تھا۔
- ۱۴- تین اہم مسائل صفحہ ۱۹۰

- ۱۵- نیز دیکھئے آزیہیل جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس کی رائے۔ پنجاب مقننہ کی شائع کردہ پبلک آراء صفحہ ۱
- ۱۶- المقارنات التشريعیہ ۵۷/۴
- ۱۷- تعجب ہے کہ ۱۸-۱۹۱۷ء میں جب اس مسئلہ پر بحث چھڑی تو قدیم نظریہ کے حامی علماء میں سے بھی کسی نے نظریہ قائم مقامی کی وجوہ رد و قبول پر کبھی بحث نہیں کی حالانکہ اصل نکتہ یہی تھا بلکہ اس زمانے کے "مناظرانہ اثرات" کے ماتحت بعض عجیب و غریب دلائل پیش کئے جاتے تھے جنہیں آج پڑھ کر آدمی بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دیکھئے اخبار الہمدیث ۱۸ مئی ۱۹۱۷ء اور ۲۹ نومبر ۱۹۱۸ء اور مولوی غلام مصطفیٰ صاحب کا اشتہار نمبر ۲۔۔۔۔۔ البتہ حال ہی میں سید غلام احمد بی اے پلیڈر منٹگمری نے اپنے رسالہ "یتیم پوتے کا حق وراثت" کے صفحہ ۱۳ تا ۱۵ پر اس اصول سے نہایت عمدہ بحث کی ہے۔
- ۱۸- کتاب ہذا صفحہ ۷۸-۸۰
- ۱۹- المقارنات التشريعیہ ۵/۴
- ۲۰- دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ نمبر ۱۶
- ۲۱- قاضی یحییٰ بن اٹم کو منصب قضاء کے چند امیدواروں کے ساتھ خلیفہ الامامون کے سامنے انٹرویو کے لئے پیش کیا گیا۔ شخصیت کچھ اچھی نہ تھی خلیفہ نے ہالی معمولی عالم سمجھ کر امتحاناً سوال کیا کہ "ایک میت نے اپنے پیچھے ماں باپ اور دو بیٹیاں چھوڑیں پھر ان دو بیٹیوں میں سے ایک مر گئی اور وارث وہی ہیں جو پہلے میت کے تھے۔ بناؤ وراثت کس طرح تقسیم ہو گی؟ قاضی یحییٰ نے عرض کیا "امیر المؤمنین! مجھے اتنا بتا دیجئے کہ میت اول مر، تھا یا عورت؟" خلیفہ قاضی کی لیاقت کو سمجھ گیا اور اسے قاضی مقرر کیا۔۔۔۔۔ اس مسئلہ کی پوری صورت دیکھنے کے لئے فتاویٰ عالمگیری جلد ۱۰ ہم کتاب الفرائض صفحہ ۷۸-۷۹-۸۰ دیکھئے۔
- ۲۲- کتاب ہذا صفحہ ۷۸-۷۹
- ۲۳- تین اہم مسائل صفحہ ۱۵۶-۱۵۷ نیز الوراثت فی القرآن صفحہ ۱۳۵-۱۳۶
- ۲۴- الوراثت فی القرآن صفحہ ۵۷
- ۲۵- دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۳۶-۳۷ ترتیب طبقات وراثہ حاشیہ ۱۰

۲۶- غالباً اسی لئے فقہ حنفی میں صرف پوتوں کے وارث ہونے کی صورت میں ان سب کو دادا کے بیٹے بیٹیاں بنا کر ورثہ علی الروس تقسیم کیا جاتا ہے (اور حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ بھی اسی کی تائید میں ہے۔ دیکھئے کتاب ہذا صفحہ ۲۸-۲۹) ورنہ اگر مردوں کا حصہ نکالا جائے یعنی تقسیم علی المنب ہو جس طرح فقہ جعفری میں ہے تو پھر بیوہ بیووں کو بھی ان کا حصہ ملنا چاہئے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ گو ایسی صورت میں شیعہ ورثہ علی المنب تقسیم کرتے ہیں لیکن بیوہ بیووں کو کچھ نہیں دیا جاتا اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔

۲۷- اس قسم کے قائم مقامی سے جس قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کی تفصیل کے لئے دیکھئے رسالہ ترجمان القرآن بابت جنوری فروری ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۲۵ تا ۳۳۰ نیز پنجاب مقننہ کی جمع کردہ پبلک آراء میں سینئر سول جج مظفر گڑھ کی رائے۔ ضمیمہ آراء (Supplement) صفحہ ۳ تا ۷۔

۲۸- ہم نے اس حل اور تقسیم کی پوری عملی تفصیل کو عمداً بخوف طوالت ترک کر دیا ہے لیکن اس ضمن میں رسالہ ترجمان القرآن فروری ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۳۲۵ تا ۳۳۰ اور سینئر سول جج مظفر گڑھ کی رائے جس کا اوپر (حاشیہ نمبر ۲۷ میں) حوالہ دیا گیا ہے۔ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

۲۹- یہ الفاظ کتاب ”تین اہم مسائل“ میں صفحہ ۱۲۳ پر موجودہ اسلامی قانون وراثت کے حق میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان الفاظ کا مقابلہ اسی قانون اسی قانون وراثت کے متعلق سر ولیم جونز (Sir William Jones) کے تبصرہ سے کیجئے (دیکھئے مقالہ ہذا صفحہ ۸ حاشیہ ۸)۔

۳۰- تین اہم مسائل صفحہ ۱۶۲ و صفحہ ۱۸۵ و صفحہ ۱۹۰ نیز الوراثة فی القرآن صفحہ ۶۰

۳۱- کتاب ہذا صفحہ ۷۸

۳۲-۳۳- ۹ جنوری ۱۹۵۲ء کو وائی ایم سی اے لاہور میں مسئلہ زیر بحث پر ایک مذاکرہ کے دوران یہ دو نئی دلیلیں (یعنی ۲ اور ۳ مندرجہ بالا) اس تفصیل سے سنی گئیں جس طرح یہاں بیان کی گئی ہیں۔ نیز دیکھئے اخبار ملت ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء (صفحہ ۱۱ کالم ۵ صفحہ ۳ کالم ۴) میں مضمون ڈاکٹر خواجہ سحاء اللہ صاحب جس میں انہیں دلائل کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

۳۳- اور قانون میں ایسی پیچیدگیاں عام ہوتی ہیں کہ ایک چیز ایک نام سے نہیں ملتی

لیکن وہی چیز دوسرے نام سے حاصل ہو جاتی ہے۔ ”وراثت“ کے نام پر کچھ نہ ملنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ”کچھ ملے گا ہی نہیں“۔ دیکھئے موجودہ پریس ایکٹ کی رو سے جب کوئی اخبار بند کر دیا جاتا ہے تو دوسرے ہی دن وہی اخبار اسی ایڈیٹر۔ اسی پریس، اسی عملہ، اسی پالیسی کے ساتھ جاری ہو جاتا ہے۔ صرف ”نام“ بدلنا پڑتا ہے اور خریدار بھی اسے سابق اخبار سمجھ کر پڑھتے ہیں۔



باب سوم

قرآن اور تحفظ مصالحتیاتی

سورۃ النساء کے دوسرے رکوع میں احکام میراث بیان کئے گئے ہیں اور پہلا رکوع تمام تر یتیمی کی پرورش و نگہداشت، ان کی کفالت و حفاظت کے طریقوں، ان سے حسن سلوک اور ان کے بارے میں خوف خدا کی تعلیم و تاکید پر مشتمل ہے۔ یتیمی کے بارے میں احکام بیان کرتے کرتے وراثت کے بنیادی اصولوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:-

الرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر۔ نصیباً مفروضاً (۱)

پھر ان مجمل اصولوں کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے دوبارہ تین آیات میں یتیمی کی طرف بالخصوص توجہ دلائی گئی ہے اور ان میں سے آخری دو آیات تو خصوصاً اپنی قوت تاثیر اور انداز تعبیر و انداز کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ ناممکن ہے کہ بے حس سے بے حس آدمی بھی انہیں پڑھ کر یتیمی کے بارے میں چونک نہ اٹھے:-

ولیخش الذین لو ترکوا من خلفهم ذریۃ ضعیفا خافوا علیہم فلیتقوا اللہ
ولیقولوا قولاً سدیداً ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلماً انما یاکلون فی
بطونہم ناراً ویصلون سعیراً (۲)

اور ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس بات سے ڈریں کہ اگر وہ بھی اپنے پیچھے (ایسی ہی) کمزور اور ناتواں اولاد چھوڑ جاتے تو انہیں ان کے متعلق (کیسا) فکر ہوتا۔ پس

چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور معقول بات کریں۔ یقیناً وہ لوگ جو ظلم سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں۔ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور جلد دکھتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

☆ آیات میراث سے قبل یتامی کے متعلق یہ آیات کیا اس طرف رہنمائی نہیں کرتیں کہ احکام میراث کو یتامی کے معاملہ سے کچھ خاص تعلق ہے؟ کیا قانون میراث کی تمہید میں یتامی کے متعلق ایسی واضح ہدایات اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتیں کہ اگر قانون کی کچھ اصطلاحی پیچیدگیاں یتامی کے بارے میں مشکلات پیدا کر دیں تو تم محض قانون پر (اور اس کی کلیت پر) مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جانا۔ یتامی کی مصلحتوں کا تحفظ بہر حال تم پر لازمی ہوگا۔ قرآن کس قدر درناک الفاظ میں یتامی کی طرف توجہ کے لئے ترغیب دلاتا ہے اور کن خوفناک الفاظ کے ساتھ ان کے حقوق سے غفلت برتنے والوں کو ڈراتا ہے۔

☆ اس کے بعد مزید تدبر کیجئے۔ آیات میراث میں ہر حکم کے بعد وصیت اور قرض کی ادائیگی کی تاکید کی گئی ہے۔ قرض کی وجہ تو فوراً سمجھ میں آجاتی ہے لیکن وصیت کو اس پر بھی ہر دفعہ مقدم کیوں کیا گیا ہے؟ کیا یہ وارثوں کی تنبیہ کے لیے نہیں ہے کہ کہیں وصیت کو قرض سے معمولی نہ سمجھ لینا۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ وارثوں پر قرض میت ادا کرنا چنداں گراں نہیں گزرتا جتنا وصیت کا نفاذ شاق گزرتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک چیز بغیر کسی عوض کے ہاتھ سے جاری ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمادی کہ دیکھو بلحاظ سرعت و وجوب اداء کے وصیت بھی قرض کے مانند ہے اور جس کے لئے مال میراث میں وصیت ہے۔ وہ وراثت سے بھی مقدم حقدار ہے۔

☆ آیات میراث میں نفاذ وصیت کی بار بار تاکید سے خود بخود ذہن میں آتا ہے کہ میراث اور وصیت کا گہرا تعلق ہے بلکہ سورۃ النساء کے ابتدائی دو رکوع بار بار پڑھ کر ذرا تدبر کریں تو دماغ میں فقط چار الفاظ گھومنے لگتے ہیں۔ یتامی میراث

وصیت اور قرض۔ کیا یہ آیات پکار پکار کر نہیں کہہ رہیں کہ اسلامی قانون میراث اور قانون وصیت بیک وقت نافذ ہونے چاہئیں؟ کیا یہ قرآن حکیم سے مذاق نہیں بلکہ اس کے دو واجب العمل اور لازم ملزوم حکموں میں سے صرف ایک کو نافذ کیا جائے اور دوسرے کو ترک کیا جاوے۔ ذرا غور و فکر سے کام لیں تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ اسلامی قانون وراثت اور قانون وصیت ہر دو صحیح نتائج پیدا کرنے میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ایک کا کام اجتماعی مصالح کی نگہداشت ہے تو دوسرا اس ”اجتماعیت“ اور عمومیت (General Principles) کے اندر انفرادی اور شخصی مصالح (Particular cases) کو نظر انداز ہونے سے روکتا ہے۔ وارث کی لئے بغیر رضامندی دیگر ورثاء اور بغیر معقول وجوہ کے وصیت کر کے اس کو قانونی حق سے زیادہ دینا منع ہے۔ اور غیر وارث رشتہ دار کو محض قانون کی عمومیت کے رحم پر چھوڑنے کی بجائے اس کے لئے وصیت کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں قوانین کے ساتھ ساتھ چلنے میں جو ہم آہنگی اور موزونیت ہے وہ ایک کے ساقط کر دینے سے کہاں برقرار رہ سکتی ہے۔

آیات میراث میں تو وصیت کے اجراء پر نفاذ پر زور دیا گیا ہے۔ اب وصیت کرنے کے متعلق قرآن حکیم کا حکم ملاحظہ کیجئے:-

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف حقاً على المتقين (۳)

(مسلمانو! تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کا آخر وقت آجائے اور وہ بطور ترکہ کچھ مال و دولت چھوڑ رہا ہو تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں منصفانہ وصیت کر جائے۔ متقی لوگوں کو ایسی وصیت کرنا ضروری ہے۔

کس قدر واضح حکم ہے لیکن افسوس ہے کہ بعض علماء آیات میراث اور حدیث ”لا وصیة لوارث“ (۴) کی بناء پر اس حکم کی منسوخی کے قائل ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ آیات میراث اور حدیث زیادہ سے زیادہ صرف اس

کے کچھ حصہ کی تخصیص کرتی ہیں۔ کیونکہ نہ تو تمام اقرباء ہمیشہ وارث ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں (مثلاً بحالت کفر) والدین بھی وارث نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

وقيل: ان الآية مخصوصة لان الاقربين اعم من ان يكونوا وارثا ---
وكانت الوصية واجبة لجميعهم فخص منها من ليس بوارث باية الفرائض
وبالحديث "لا وصية لوارث" (۵)

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت (منسوخ نہیں بلکہ) مخصوص ہے کیونکہ اقرباء کا لفظ ورثاء سے زیادہ عام ہے اور (پہلے تو) ان سب اقرباء کے لئے وصیت واجب تھی۔ لیکن آیات میراث اور حدیث "لا وصية لوارث" سے (وجوب وصیت کے لئے) غیر ورثاء مخصوص کر دیئے گئے۔

در اصل قائلین نسخ کی نظریں وصیت کی حکمتوں اور مصلحتوں کو نہ پا سکیں
(۶) اسی لئے علماء کے ایک گروہ نے نہ صرف اس آیات کے متعلق نظریہ نسخ کا بطلان کیا بلکہ ہمیشہ وصیت کے واجب اور لازمی ہونی پر زور دیا (۷)۔ علامہ ابن حجرؒ اندلسی لکھتے ہیں:

وفرض على كل مسلم ان يوصى لقرابة الذين لا يرثون اما لرق واما لكفر
واما لان هنالك من يحجبهم من الميراث اولانهم لا يرثون فيوصى لهم بما
طابت به نفسه لا حد في ذلك --- فان اوصى لثلاثة من اقاربه
المذكورين اجزأه (۸)

ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے ان رشتہ داروں کے لئے وصیت کرے جس قدر اس کا جی چاہے۔ اس میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اور اگر کم از کم تین ایسے رشتہ داروں کے لئے وصیت کر دے تو اس نے فرض ادا کر دیا۔

علامہ موصوف نے کبار تابعین میں سے ان بزرگوں کے نام دیئے ہیں جو غیر وارث اقرباء کے لئے وصیت کرنا واجب قرار دیتے تھے۔ چند ایک نام یہ ہیں:-

عبدالہ بن طاؤسؒ قتاوہ سعید بن المسیبؒ مسروقؒ سالم بن یسارؒ علاء بن زیادؒ عبدالمملک بن یعلیٰؒ اور ایاس بن معاویہؒ وغیرہ۔

اور جو لوگ وجوب وصیت کے قائل نہیں ان پر سخت تنقید کرتے ہوئے آخر پر لکھتے ہیں۔

ان هذا لمن قبيح التدليس في الدين وليت شعري اى شىء فى هذا مابيع ان لايوصى لقرايته (۹)؟

یہ بات (کہ وصیت کرنا واجب نہیں) تدلیس فی الدین (یعنی دین کے بارے میں دھوکہ بازی کرنے) کی بدترین مثال ہے۔ کاش کوئی مجھے بتا سکتا کہ آخر اس بارے میں (ان کے پاس) کون سی ایسی شے (دلیل) ہے جس سے رشتہ داروں کیلئے وصیت نہ کرنا جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

پھر آگے چل کر آیت وصیت کے متعلق نسخ کے قائلین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

--- فقد قال الباطل وقفا ما لا علم له به. وقال على الله تعالى ما لا يعلم و ترك اليقين و حكم بالظنون. وهذا محرم بنص القرآن (۱۰).

--- تو (جو اس آیت کے نسخ کا قائل ہوا) اس نے جھوٹ کہا۔ اور ایک ایسی بات پر اڑا جس کے متعلق وہ بالکل بے خبر ہے اور اس نے اللہ تعالیٰ پر ایسی بات کہہ دی جس کا اسے کچھ علم نہیں۔ اور اس نے یقین کو چھوڑا اور گمان و ظن کی بناء پر (ایک) فیصلہ کر لیا اور حالانکہ ایسا کرنا نص قرآن کی رو سے قطعاً حرام ہے۔

اگرچہ آیت وصیت کے الفاظ ”کتب علیکم“ اور ”حقاً علی المتقین“ خود ہی اپنے مفہوم (ایجاب وصیت) کی دلالت پر برہان قاطع ہیں لیکن سنت سے اس کی مزید تاکید ثابت ہوتی ہے۔ شیخین نے بطریق نافع عن ابن عمرؓ مندرجہ ذیل حدیث کی تخریج کی ہے۔

۱. حق امری ء مسلم له شىء یرید ان یوصى فيه یبیت لیلین الا و وصیة

مکتوبہ عندہ (۱۱)۔

کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے پاس کوئی شے (مال وغیرہ) قابل وصیت ہو۔ اور (پھر بھی) دو راتیں اس پر بغیر تحریری وصیت پاس ہونے کے گزر جائیں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ جو اس حدیث کے راوی اول ہیں فرمایا کرتے تھے:

ما مرت علی لیلۃ مذسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ذلک الا
وعندی وصیتی (۱۲)

جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ کوئی رات مجھ پر ایسی نہیں گزری کہ میرے پاس اپنی وصیت موجود نہ رہی ہو۔

اسی طرح حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے متعلق بہت سختی کیا کرتے تھے (۱۳)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وجوب وصیت کے قائلین کا مسلک کس قدر اقرب الی القرآن اور قرین صواب ہے۔

پھر اس کے ساتھ ہی اگر آپ یتامی کے متعلق قرآن حکیم کے احکام پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں بہت کم مقام ایسے ہیں جہاں گناہ اور برائی کے بیان میں یتامی پر سختی یا ان سے غفلت، ان کی حق تلفی، ان کی دل شکنی، ان سے سخت کلامی اور ان پر ظلم وغیرہ کا ذکر موجود نہ ہو۔۔۔ اور اسی طرح بہت کم مقام ایسے ہیں جہاں نیکی اور بھلائی کے بیان میں یتامی کی ادا و پرورش، ان کی تربیت، ان کی حفاظت و کفالت، ان کے معاملات میں دیانت و تقویٰ، ان کے احوال و حقوق کی نگہداشت اور ان سے ہمدردی و نغم خواری وغیرہ کا ذکر نہ لیا گیا ہو۔

یتامی کے متعلق قرآن کے ان تمام مجموعی احکام کو (جن سے کوئی معمولی قرآن دان بھی ناواقف نہیں ہے اور جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری تطویل کا باعث ہوگی) (۱۴)۔ ان آیات میراث و وصیت کے ساتھ ملا کر تدبر کیجئے تو کم از کم یتامی اور پھر خصوصاً محبوب الارث یتامی کے بارے میں تو وجوب وصیت پر

آپ کو شرح صدر حاصل ہو جائے گا۔

الغرض قانون وراثت ایک عمومی و کلی قانون ہے جس کا مقصد عمومی و اجتماعی مصلحتوں کی نگہداشت ہے۔ ایسے کلی قانون میں شخصی و انفرادی مصالح کی مراعات ناممکن ہوتی ہے۔ (اور یہ قوانین کلیہ کے مزاج کا خاصہ ہے چاہے وہ وضعی ہوں یا الہامی) لیکن یہ قرآن کی حکیمانہ بصیرت کا اعجاز ہے کہ وہ انفرادی اور شخصی مصالح کو بھی اجتماعی و عمومی مصالح کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیتا۔ چنانچہ قرآن کا قانون وصیت اس کے قانون وراثت کے تتمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے ذریعے سے نہ صرف محبوب الارث اقرباء (جن میں سے ایک یتیم پوتا بھی ہے) بلکہ اولاد خفیہ مشکل، مفقود الخمر اشخاص، غیر مسلم والدین اور بہت سے دوسرے ایسے اشخاص کی انفرادی مصلحتوں کا تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ جو اگرچہ وراثت کے کلی قانون کی رو سے نقصان اٹھا سکتے ہیں لیکن جن کی خبرگیری اور ادائیگی حقوق بہر حال واجب ہے۔

☆☆☆

حواشی اور حوالہ جات

(۱) النساء / ۷ ترجمہ کے لئے دیکھئے کتاب ہذا کے پہلے حصے کا باب اول

(۲) النساء / ۱۰۹

(۳) البقرة / ۱۸۰

(۴) خیال رہے کہ یہ حدیث روایتاً درایتاً کسی طرح اعتراضات سے خالی نہیں ہے (الف)

حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں ”یہ حدیث مرفوع تو ہے لیکن شرط بخاری پر ثابت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس عنوان (اوصیۃ

لوارث) سے ایک باب تو باندھا۔ لیکن اس میں حدیث کی بجائے ابن عباس کا ایک قول نقل کیا ہے۔ جو معنی عنوان باب کی تائید کرتا ہے (بخاری ج ۲ / ۱۸۷)۔۔۔

ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارقطنی اور احمد نے اسے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ لیکن ان اسناد میں سے کوئی بھی اعتراض سے خالی نہیں مسلم نے اس حدیث

کی تخریج ہی نہیں کی۔ اور موطا مالک میں بھی یہ حدیث موجود نہیں (الترغیب اس مضمون کا فتویٰ موجود ہے) گو مجموعی طور پر یہ روایات حدیث کی اصل کو مضبوط کرتی

ہے۔ بلکہ امام شافعی نے تو ”ام“ میں اسے متن متواتر تک کہہ دیا ہے۔ ”(المنہج از حاشیہ بلوغ المرام صفحہ ۱۹۹)

(ب) فیض الباری شرح بخاری میں صاف لکھا ہے کہ حدیث با اتفاق ضعیف ہے (فیض

الباری ۳ / ۴۰۹) اس کے بعد ابن القطان کی اس بحث کا ذکر ہے کہ حدیث ضعیف

پر جب امت عملاً اجماع کر لے تو کیا وہ صحیح کا درجہ حاصل کر لیتی ہے یا نہیں؟

(صاحب فیض الباری اپنا رجحان اس گروہ کی طرف بتاتے ہیں جو اس سوال کا

جواب اثبات میں دیتا ہے)۔

الغرض بلحاظ اسناد روایت یہ حدیث ہرگز اس درجہ کو نہیں پہنچتی کہ اس سے آیت

قرآنی کو منسوخ تو کہا مخصوص یا مقید بھی کیا جاسکے اور صاحب فیض الباری کا

رجحان بھی مضار و مفاسد سے خالی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس

طرح لا ایمان لمن لا امانة له' وغیرہ کی قسم کی احادیث کو نفی کمال پر محمول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس حدیث سے بغیر کسی معقول وجہ کے کسی وارث کو بذریعہ وصیت کچھ زیادہ دینا۔۔۔ ناجائز ثابت ہوگا۔ لیکن جب عقلاً و شرعاً قبول وجوہ موجود ہوں تو وارث کے لئے بھی وصیت کرنے سے یہ حدیث نہیں روک سکتی۔ کیونکہ ”ظاہر کتاب“ سے مطلق وجوب وصیت ثابت ہوتا ہے۔ بغیر کسی ”قطعی حجت“ کے اسے قطعیت کے ساتھ مقید نہیں کیا جاسکتا۔

- (۵) بلوغ المرام حاشیہ صفحہ ۱۹۹ (بحوالہ فتح الباری)
- (۶) اس پر مفصل بحث کے لئے دیکھئے تفسیر المنار ۲/۱۳۲ بعد
- (۷) یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سورہ المائدہ جس کا نمبر ترتیب نزول کے لحاظ سے ۱۱۲ ہے (اس کے بعد صرف سورہ التوبہ اور النصر نازل ہوئیں) اس میں بھی وصیت کا ذکر موجود ہے۔ (المائدہ/۱۰۶)
- (۸) المجلد ۹/۳۱۴ مسئلہ نمبر ۱۷۵۱
- (۹) المجلد ۹/۳۱۴ مسئلہ نمبر ۱۷۵۱
- (۱۰) ایضاً
- (۱۱) مسلم ۶/۷۰ نیز المجلد ۹/۳۱۳ مسئلہ نمبر ۱۷۴۹
- (۱۳) المجلد ۹/۳۱۲
- (۱۴) قرآن حکیم میں حسب ذیل (۲۲) مقامات پر یتیم و یتامی کا ذکر آیا ہے۔۔۔ البقرہ ۸۳/۱۷۷، ۲۱۵، ۲۲۰۔۔۔ النساء/۳، ۶، ۸، ۳۶، ۱۲۷، الانعام/۱۵۲، الانفال ۳۱/، بنی اسرائیل/۳۴، الکہف/۸۲، الحشر/۷، الدھر/۸، الفجر/۱۷، البلد/۱۵، الضحیٰ: ۶، ۹۔ الماعون/۲



باب چہارم

قانون وصیت کی ضرورت

قرآن کے احکام وصیت میں پوشیدہ حکمتیں اور مصلحتیں اور آیات میراث میں۔ نفاذ وصیت کی بار بار تاکید اس بات کی متقاضی ہیں کہ جہاں اسلامی قانون وراثت جاری ہو وہاں لازماً قانون وصیت بھی نافذ ہو۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وراثت کے ساتھ وصیت کا قانون نافذ نہ کرنا صریحاً احکام قرآنی کی خلاف ورزی ہے۔ تعجب ہے کہ جو لوگ یتیم پوتے کو وراثت دلوانے میں اس قدر سرگرداں ہیں وہ اس طرف کیوں توجہ نہیں دیتے۔ جس سے نہ صرف یتامی بلکہ بیوہ بہنوں، مفلس و نادار بھائیوں اور دوسرے محتاج و قابل امداد اقرباء کے لئے آسان و سہل تر قانونی صورت امداد پیدا ہو سکتی ہے۔۔۔ اگر حکومت قانون وراثت کے ساتھ بیوہ و وصیت کے اسلامی قانون بھی نافذ کرے۔ اور بھاری نیکسوں اور عدالتی فیسوں کی ان غیر اسلامی رکاوٹوں اور تنکیوں کو دور کر دے۔ جو ان قوانین کے نفاذ کو عملاً مشکل بنا دیتی ہیں۔ تو ملک میں شاذ ہی کوئی ”محروم الارث“ پوتا نظر آئے گا۔

چونکہ وجوب وصیت کا مسئلہ امت کے مایہ ناز علماء کے ایک گروہ کے مختارات فقہیہ میں سے رہا ہے۔ اس لئے اس بارے میں حکومت کے لئے مزید قانون سازی کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے مثلاً اگر کسی ایسے محبوب الارث یتیم پوتے کے لئے جس کو اس کا دادا بذریعہ بیوہ یا وصیت کچھ نہ دے سکا ہو۔۔۔ اس کے دادا کی جائیداد سے ایک حصہ بطور وصیت دینا قانوناً واجب قرار دیدیا جائے۔۔۔ تو یہ قانون وراثت میں کسی طرح فٹ نہ ہو سکنے والے نظریہ قائم مقامی کی نسبت

بدرجہ زیادہ سہل العمل اور مضرات و مفسدات سے نسبتاً محفوظ طریق کار ہوگا۔
اس کی ایک مثال حکومت مصر کے قانون میں موجود ہے۔۔۔ حکومت
مصر نے اپنے ایکٹ نمبر ۷۱، ۱۹۳۶ء کی رو سے ملک میں جو قانون وصیت نافذ کیا
ہے اس میں اس قسم کی وصیت کے لئے خاص دفعات رکھی ہیں۔ چنانچہ اس کی دفعہ
۷۶ یوں ہے:-

اذا لم يوص المیت لفرع ولده الذی مات فی حیاته اومات معه ولو حکما۔
بمثل ما کان يستحقه هذا الولد میراثا فی ترکته لو کان حیا عند
موتہ۔۔۔۔۔ وجبت للفرع فی التركة وصية بقدر هذا النصيب فی حدود
الثلث۔ بشرط ان يكون غير وارث و ان لا يكون المیت قد اعطاه بغير
عوض من طریق تصرف اخر قدر ما يجب له ان کان ما اعطاه اقل منه
وجبت له وصية بقدر ما يكمله:-

جب میت اپنی اس اولاد کے لئے جو اس کی زندگی میں مر چکی ہے یا وہ اس کے
ساتھ مری ہو یا اس پر قانوناً موت کا حکم لگایا جاسکتا ہو۔ اس قدر مال کی وصیت نہ
کر مرا ہو جتنا اس (مرنے والی) اولاد کا حق ہوتا۔ اگر وہ (متوفی) اولاد اس (میت)
کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوتی۔۔۔۔۔ تو اس (متوفی اولاد) کی اولاد کے لیے
ترکہ میت میں سے $\frac{1}{3}$ کی حد کے اندر اندر اس کا وہ ممکن حصہ بطور وصیت دینا
واجب ہوگا۔ (یعنی اگر وہ متوقع حصہ ترکہ کے $\frac{1}{3}$ سے کم ہی کم میں پورا ہو گیا تو
اسے تمام $\frac{1}{3}$ نہیں دیا جائے گا بلکہ وہی حصہ ملے گا اور اگر حصہ ترکہ کی تہائی
سے زائد بنتا ہو تو $\frac{1}{3}$ ہی اسے دے دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں
ملے گا) لیکن شرط یہ ہے کہ وارث نہ بن رہا ہو اور نہ ہی (میت) اسے کسی
دوسرے طریقے سے بغير کسی عوض کے (ہبہ) اس کے واجب حصہ کے برابر مال
دے چکا ہو۔ اور اگر (اس طرح مال) دیا تو ہو لیکن وہ اس کے واجب حصے سے کم
ہو۔ تو صرف اتنے کے لئے وصیت واجب سمجھی جائے گی جس سے اس کا حصہ پورا

ہو جائے۔

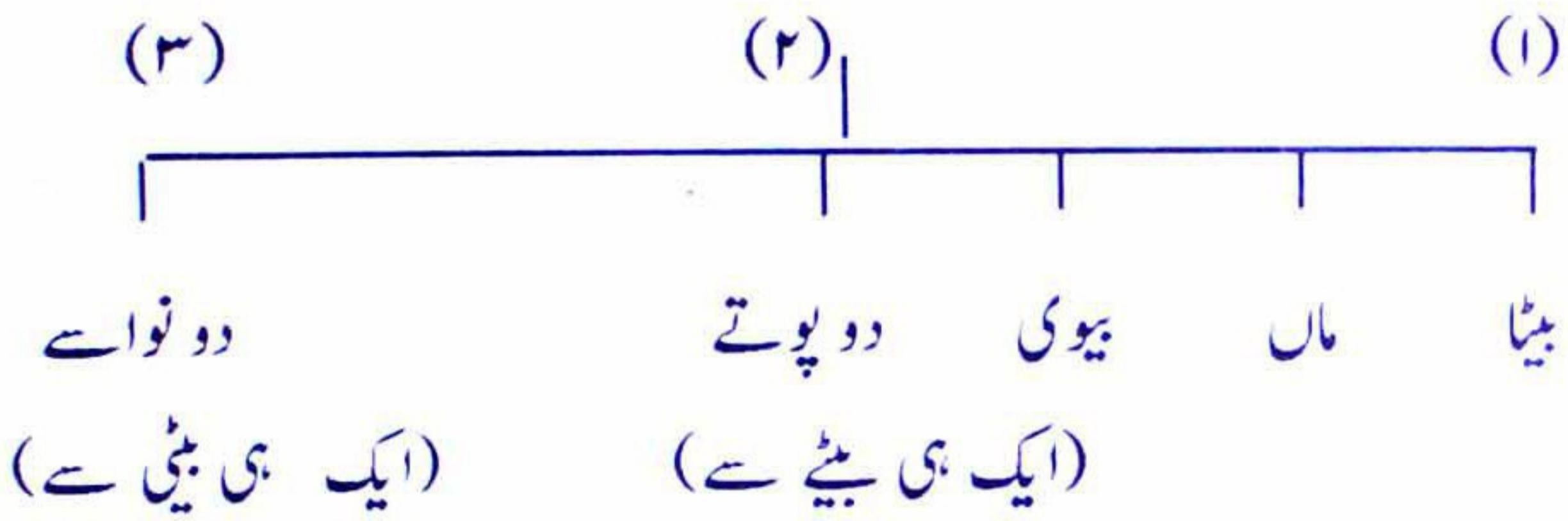
وتكون هذه الوصية لاهل الطبقة الاولى من اولاد البنات ولاولاد الابناء
من اولاد الظهور وان نزلوا. على ان يحجب كل اصل فرعه دون فرع غيره.
وان يقسم نصيب كل اصل على فرعه وان نزل قسمة الميراث. كمالو كان
اصله او اصوله الذين يدلى بهم الى الميت ما توا بعده وكان موتهم مرتبا
كترتيب الطبقات (۲)

اور یہ وصیت (واجب) بیٹیوں کی اولاد میں سے صرف پہلے طبقہ (نواسوں نواسیوں)
اور بیٹیوں کی صلبی اولاد کے لئے نیچے تک (پوتوں، پڑوتوں، سکڑوتوں تک) نافذ ہو
گی۔ اس طرح سے کہ ہر اصل اپنی فرع کو تو محبوب کرے گا لیکن دوسرے کی فرع
کو محبوب نہ کر سکے گا اور ہر اصل کا حصہ اسی کی فرع پر (اور اسی طرح نیچے تک)
بطریق میراث تقسیم ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا اس اصل کی موت جس کے
واسطے سے یہ میت کے رشتہ دار ہیں۔ اس کی موت کے بعد واقع ہوئی۔ اور اگر
نیچے اوپر کئی مرچکے ہوں۔ تو اسی طرح مرنے کی ترتیب بھی طبقہ وار کی
جائے گی۔

اس کے ساتھ ہی اس قانون کی دفعہ نمبر ۸۔ میں تصریح کر دی گئی ہے
کہ اگر میت اپنی ایسی محبوب الارث اولاد الاواد کے لئے تو کوئی وصیت نہ کرے
ہو لیکن کسی اور (اجنبی) کے لئے وصیت کر گیا ہو تو بھی یہ وصیت نافذ العمل
نہیں ہوگی جب تک کہ $\frac{1}{3}$ میں سے محبوب الارث اولاد الاواد کا حصہ پورا نہیں
کر لیا جائے گا۔ اگر کچھ بچ رہا تو بقیہ اس اجنبی موصی لہ کو دیا جائے گا ورنہ اس
کچھ بھی نہیں ملے گا۔

ذیل میں ہم مصری قانون وصیت کی ان دفعات کے اطلاق کو چند مثالوں
سے واضح کرتے ہیں تاکہ اس کی افادیت ظاہر ہو جائے (۳)۔

متوفی

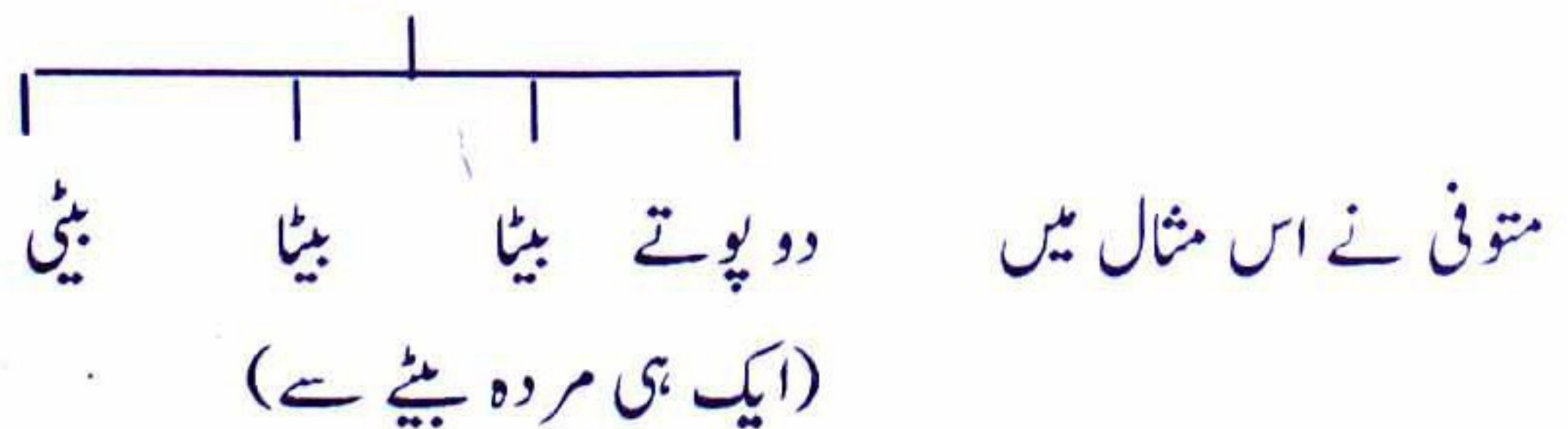


اس صورت میں ”وصیة واجبة“ پوتوں اور نواسوں کیلئے قائم ہوگی۔ لیکن اگرچہ ان کی اصل یعنی بیٹا نمبر ۲ اور بیٹی نمبر ۳ کا حصہ کل جائیداد کے $\frac{1}{3}$ سے زیادہ ہوتا تھا۔ تاہم وصیت صرف $\frac{1}{3}$ میں جاری ہوگی اور وہ $\frac{1}{3}$ دو پوتوں اور نواسوں میں $1:2$ (بیٹا بیٹی) سے تقسیم ہوگا۔ پس دو پوتوں کو $\frac{1}{3}$ کا $\frac{2}{9} = \frac{2}{3} \times \frac{1}{3}$ اور دو نواسوں کو $\frac{1}{9} = \frac{1}{3} \times \frac{1}{3}$ ملے گا۔ اب باقی $\frac{2}{3}$ بیٹے، ماں اور بیوی میں حسب میراث تقسیم ہوگا تو ماں $\frac{2}{3}$ کا $\frac{1}{6} = \frac{1}{9} \times \frac{2}{3}$ اور بیوی کو $\frac{2}{3}$ کا $\frac{1}{8} = \frac{1}{9} \times \frac{2}{3}$ اور بیٹے کو $\frac{1}{12} = \frac{1}{9} + \frac{1}{9} + \frac{2}{9}$ ملے گا۔

خیال رہے کہ تہائی سے زیادہ میں وصیت نافذ نہ کرنے کے باعث پوتوں اور نواسوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ ہر پوتے کو اس کے ”اصلی حصہ“ سے صرف $\frac{11}{360}$ حصہ کم مل رہا ہے۔

مثال نمبر ۲

متوفی



خاص محبوب الارث پوتے کے لئے وصیت واجب قرار دینے سے یہ مسئلہ ایک حد تک نہایت عمدہ اور مزاج قرآنی سے قریب تر طریقے پر حل ہو جاتا ہے لیکن یہ صرف قانون وصیت کی عام ضرورت اور اس میں ایک خاص ترمیم اور اس کی کیفیت و نتائج کا ذکر تھا۔ اگلے باب میں ہم اسلامی قانون وراثت کا ان ہی پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔



حواشی و حوالہ جات

(۱) المواریت الاسلامیہ صفحہ ۷۳

(۳) یہ مثالیں کتاب المواریت الاسلامیہ کے آخری حصہ (صفحات ۱۴۰ تا ۱۴۵) میں دی ہوئی

تشریحات سے منتخب کی گئی ہیں۔



باب پنجم

اسلامی قانون وراثت میں ترمیم کے امکانات

قرآن حکیم کا اعلانیہ دعویٰ ہے کہ وہ انسانی حالت کی اصلاح کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ اور انسانی حالات ہر لمحہ تغیر پذیر ہیں۔ اسلام زندگی کا دستور العمل ہے اور زندگی ساکن و جامد شے نہیں ہے بلکہ زمان و مکان کے ساتھ ساتھ اس کے ضروریات و مقتضیات بدلتے چلے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود زندگی محض اور مطلق تغیر و انقلاب ہی کا نام نہیں ہے۔ اس کی ایک مستقل و محکم بنیاد اور مضبوط و ناقابل تبدیل اساس بھی ہے جسے قرآن لفظ ”فطرت“ سے تعبیر کرتا ہے اور قرآن ہی آسمانی ہدایت کا وہ آخری ایڈیشن ہے جس میں زندگی کے ان اندرونی اور بیرونی تقاضوں کو نہایت خوبی سے ملحوظ رکھا گیا ہے اور کیوں نہ ہو الا يعلم من خلق وهو اللطیف الخبیر؟ (۱)

اسلامی قانون انسانی فکر و نظر اور فقہ و دانش کی رفتار ترقی کو روک نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے لئے صرف نشان راہ متعین کر دیتا ہے تاکہ وہ بے راہ روی سے بچا رہے۔ یہ نشانات راہ، یہ غیر متبدل اصول اسلامی قانون کی اپنی ہستی اور انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے اٹل اور قطعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس خوبی اور حکمت سے وضع کئے گئے ہیں کہ ان کا دامن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لئے تنگ نہیں ہو سکتا۔ اسلامی قانون کی اس بے اندازہ وسعت اور ترقی پذیری پر صحابہؓ تابعینؓ تبع تابعینؓ اور مسلمانوں کے فکری عروج کے زمانہ کے فقہاء و ائمہ مجتہدین کی اجتہادات، تاویل و

الغرض اس قسم کے متعدد واقعات اور نظائر موجود ہیں جن سے وقت کی ضروریات اور حالات کے اقتضاء سے فقہی فیصلوں کو بدلنے کا ثبوت ملتا ہے اور ہر زمانے میں ایسا کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً مختلف فیہ مسائل میں تو اس کی گنجائش بہت زیادہ ہے (۶)۔ لیکن اس بارے میں کچھ احتیاطیں ضروری ہیں۔ خصوصاً ایک تو یہ کہ فیصلہ کرنے والے اشخاص دینی تعلیم اور ذہنی تربیت کے بلند معیار پر ہوں اور عربی زبان کی مہارت، شریعت کے جملہ احکام میں گہری بصیرت، معاملات زندگی کا عمدہ فہم، قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہ اور ذاتی تقویٰ اور خوف خدا۔۔۔ کی صفات جس شخص میں ہوں صرف اسی کی بات قابل قبول سمجھی جائے۔

اور دوسری بات یہ کہ نئے حکم سے قرآن کے کسی صریح حکم کی خلاف ورزی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ اور بالخصوص ایسا حکم جس کی عدم تعمیل پر عذاب کی وعید موجود ہو۔

ان امور کی روشنی میں اسلامی قانون وراثت میں جس قدر حصہ اجتهاد و قیاس پر مبنی ہے وہ کسی وقت بھی نظر ثانی کا محتاج ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں دادا کی میراث کے متعلق سو مختلف رائیں قائم کیں اور بعض مسائل کے متعلق تو وہ مرتے دم تک کوئی قطعی رائے قائم نہ کر سکے (۷)۔ آج بھی کوئی اسلامی حکومت ماہرین فن (علمائے دین) کی مدد سے قرآن و سنت کی روشنی میں حدود اللہ کے اندر رہ کر قانون میں ترمیم یا تبدیلی کر سکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ایک مثال حکومت مصر کے جدید قانون وراثت (حکومت مصر کا ایکٹ نمبر ۷۷، ۱۹۴۳ء) میں ملتی ہے۔

اس قانون میں مراتب استحقاق وراثت (۸) میں موالی العتاقہ اور ان کے منصبات کو چھٹے نمبر پر رکھا گیا ہے حالانکہ بالاتفاق ان کو تیسرے درجہ پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ذوی الارحام کے بعد پانچویں نمبر پر الرد علی احد الزوجین کو رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اہل سنت کے چاروں ائمہ زوجین پر رد کے کسی صورت میں

قائل نہیں ہیں (۹)۔ لیکن حکومت مصر نے اس بارے میں حضرت عثمانؓ کی رائے پر عمل کیا ہے۔۔۔ پھر بعض خاص مسائل مثلاً "مسئلہ اکردریہ" اور "مسئلہ مشترکہ" وغیرہ میں بھی کسی خاص فقہی سکول کی پابندی نہیں کی گئی (۱۰)۔ محبوب الارث یتیم پوتے کے مسئلہ کو حکومت مصر نے اپنے قانون وصیت واجبہ کے ذریعے حل کیا ہے۔ قانون وراثت میں کوئی ترمیم نہیں کی۔

اس وقت ہمارے سامنے غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ قانون وراثت میں اس غرض کی لئے کسی ترمیم وغیرہ کا امکان ہے یا نہیں؟

جہاں تک محبوب الارث یتیموں کے مستقبل کی حفاظت کے لئے ان کو اپنے دادا کی جائیداد سے حصہ دلانے کے لئے کوئی قانونی ذریعہ مہیا کرنے کا تعلق ہے۔ یہ مقصد خلاف اسلام نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ عین تقاضائے تعلیم قرآن ہے۔ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ چونکہ یتیم پوتا محبوب الارث ہے اس لئے اس کو کچھ دلانے کا ذریعہ پیدا کرنا خلاف احکام اسلام ہے تو یہ سراسر اس کی جہالت اور فہم قرآن سے بالکل کورا ہونے کا ثبوت ہوگا۔ ونعوذ باللہ ان نکون من الجاهلین۔ اب اس طرف آئیے کہ وہ "قانونی ذریعہ" کیا ہو؟ ممکن قانونی ذریعے چار ہو سکتے ہیں۔ (۱) بیہ (۲) وصیت (۳) نفقہ (۴) وراثت۔ یہاں ہمیں مومن الذکر سے بحث کرنا مطلوب ہے۔۔۔ یہ بالکل بدیہی سی بات ہے کہ یتیم پوتا اپنے دادا یا دادی کی جائیداد سے "بطور وراثت" اسی صورت میں کچھ پاسکتا ہے جبکہ اسے اپنے باپ کا قائم مقام تسلیم کر لیا جائے لیکن ہم اس بات پر مفصل بحث کر چکے ہیں کہ بطور قاعدہ کلیہ کے اصول نیابت اسلامی قانون وراثت میں کسی طرح بھی نہیں چل سکتا۔ اور جہاں تک اس "کلیت" کا تعلق ہے فقہائے متقدمین نے قرآن کا مفہوم سمجھنے میں ہرگز کوئی خلطی نہیں ہوئی (۱۱)۔

اب ایک صورت یہ رہ جاتی ہے کہ یتیم پوتے کی خاطر قانون وراثت میں ایک استثناء تسلیم کیا جائے (۱۲) مثلاً یوں کہ "صرف اس احوال کی صورت میں:

اپنے ماں یا باپ کی زندگی میں مر جائیں اور اپنے پیچھے اپنی فرع (اولاد) بھی چھوڑ جائیں تو بطور استثناء انکی موت کو اپنے مورث کی موت کے بعد فرض کر کے انکا حصہ نکالا جائے اور پھر ان کی موجودہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔۔۔۔۔ اگرچہ اس قسم کی قانون سازی میں ایک خودرایانہ پہلو پایا جاتا ہے جو مفاسد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ (کیونکہ قرآن کے متعدد قسم کے مقرر کردہ وارثوں میں سے ہم صرف ایک قسم کے لئے یہ حق تسلیم کر رہے ہوں گے)۔۔۔۔۔ تاہم محض اس بنا پر کہ اس کا مقصد ایک مصلحت شرعی۔۔۔۔۔ مصالحت یتامی۔۔۔ کا تحفظ ہے، لہذا اس قسم کے استثناء کو روح اسلام کے منافی نہ سمجھتے ہوئے جائز گردان بھی لیں۔ لیکن آئیے اب غور کیجئے کہ اس طرح یتیم کو حاصل کیا ہوگا؟

جب آپ اس طرح کسی مرنے والے (کی موت مورث کے بعد فرض کر کے اس) کا حصہ نکالیں گے تو وہ تمام کا تمام حصہ اس کی اولاد میں ہرگز تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ از روئے قرآن اولاد کی موجودگی میں بھی ماں یا باپ اور خاوند یا بیوی میں سے جو بھی موجود ہوں گے ان کا حصہ نکالنا ضروری ہے۔ گویا قرآن کی تقسیم وراثت کی رو سے اولاد کے ہوتے ہوئے بھی نصف کے قریب یا بعض دفعہ نصف سے زیادہ جائیداد دوسرے وارث لے سکتے ہیں مثلاً جب میت کی اولاد کے ساتھ اس کے والدین اور بیوی بھی موجود ہوں تو $22/11$ حصہ تو یہ لے جائیں گے اور باقی $22/13$ اولاد میں تقسیم ہو گا۔ اسی طرح اگر میت عورت ہو اور اولاد کے ساتھ والدین اور خاوند بھی چھوڑ رہی ہو تو اس کے ترکے کا صرف $12/5$ حصہ اس کی اولاد کو ملے گا۔

اب اگر ہم منہ بہ منہ بالاستثناء کو تسلیم کرتے ہوئے ایک مردہ بیٹے کا حصہ نکالیں اور اس کی " " لے علاوہ اس کی بیوی اور ماں بھی زندہ موجود ہوں تو ان کو $1/8 + 1/6 = 1/22$ یعنی تہائی کے قریب لازماً دینا پڑے گا۔ (۱۳)۔۔۔۔۔ تو اس طرح یہ نیا استثناء تقسیم کرنے لینے کے باوجود بھی یتیم پوتے کو بہت کم صورتوں میں اپنے

باپ کی پوری جائیداد مل سکتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس ہم دیکھ چکے ہیں کہ قانون وصیت کی رو سے بعض صورتوں میں اس کی مصلحتوں کے پیش نظر اسکے متوقع حصے سے زیادہ (ثلث کی حد کے اندر رہتے ہوئے بھی) دیا جاسکتا ہے۔ اور اگر مصری قانون کی طرح "وصیت واجبہ" نافذ کی جائے تو بھی شاذ صورتوں میں اسے اپنے متوقع حصے سے کم مل سکتا ہے (۱۴)۔ اور پھر قانون وصیت سے صرف یتیم پوتے کا ہی نہیں بلکہ اور بھی محتاج اقرباء کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ نیز اس سے قرآن کے ایک حکم کی تعمیل بھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی قانون جبہ وصیت کے ہوتے ہوئے قانون وراثت میں خاص محبوب الارث پوتے کے لئے کسی استثناء یا ترمیم وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور نہ ہی یہ زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اصل ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسلامی قانون وراثت کے ماتحت فوراً اسلامی قانون وصیت نافذ کیا جائے اور ایسی خاص صورتوں میں جبکہ وہ انہی تو زندگی میں کچھ دے سکا ہو اور نہ ہی وصیت کرے گا ہو (اور قانون وصیت کے نفاذ کے بعد ایسے واقعات (Cases) بہت کم بلکہ شاذ ہی پیش آئیں گے) تو اس کے لئے چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) حکومت خود ایسے یتامی کی کفالت اپنے ہاتھ میں لے لے اور یہ سب سے بہترین اور صحیح ترین اسلامی صورت ہے۔

(۲) وارث پچاؤں پر نفقہ تا حد بلوغ واجب قرار دیا جائے۔ یہ صورت بھی ہماری فقہ میں موجود ہے اور موجودہ زمانے میں بعض ممالک میں اس کے مماثل قانون بھی ملتے ہیں مثلاً انگلستان میں فرزند اکبر کی صورت میں باقی کے افراد نفقہ پاتے ہیں۔

(۳) مصری قانون کی طرح ایسی خاص صورت کے لئے "وصیت واجبہ" نفاذ کا اختیار عدالت کو دیا جائے۔

(۴) ایسی مخصوص صورتوں کے لئے اس قسم کا استثناء تسلیم کیا جائے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے لیکن ایسا 'استثناء' اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ وہ واقعی "مایتبب بطریق الضرورة فيقدر بقدر الضرورة" کے فقہی اصول کے مطابق ہو۔ یعنی زیادہ سے زیادہ قرآنی حدود میں مقید ہو۔ اصول قائم مقامی کے باآسانی چلانے کے لئے صرف "نسبی رشتہ داروں" پر اس کا اطلاق کرنا یقیناً صریحاً خلاف قرآن ہوگا اور اسے ہرگز روا نہیں رکھا جا سکتا۔

ہماری رائے میں مؤخر الذکر ہر دو صورتیں "جائز" اور "مباح" کی حد تک ہیں۔ جبکہ وصیت کا قانون نافذ کرنا اور یتامی کی کفالت خود حکومت کا اپنے ذمہ لینا "ضروری" اور "واجب" کے درجہ میں ہیں اور واجب اصلی کو نظر انداز کر کے ضرورتاً جائز چیز کو واجب کرنے کے لئے بے چین ہونا صحیح اسلامی روح کی بجائے بعض دوسرے عوامل کے اثرات کی غمازی کرتا ہے؟



حواشی اور حوالہ جات

- (۱) الملک / ۱۴
- (2) Reconstruction of Religious Thought in Islam, page: 168
- (۳) خطبات اقبال (انگریزی) صفحہ 1۸
- (۴) اصول التشریح الاسلامی صفحہ ۸۳
- (۵) الفاروق صفحہ ۱۷۱ و صفحہ ۲۳۷ نیز اصول التشریح الاسلامی صفحہ ۸۵
- (۶) بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس مسئلہ پر امت میں متعدد نظریات موجود ہیں ان میں سے ہر ایک نظریہ مخصوص حالات و ضروریات میں اس مسئلہ کا نتیجہ اور صحیح ترین حل قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً خلافت و امارت کے مسئلے میں شیعوں سے نظریہ قرشیت اور شیعوں کے نظریہ امامت کے مقابلے پر آج خوارین کا نظریہ انتخاب "کس قدر قرین صواب نظر آتا ہے۔"
- (۷) الفاروق صفحہ ۲۳۲
- (۸) عام مروجہ ترتیب کیلئے دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۴۴ حاشیہ ۱۰
- (۹) البتہ اگر ایسا رشتہ ہو جس میں فرض اور تعصیب جمع ہو جائیں مثلاً ان کا ابن فرشتہ (سگے چچا کا بیٹا) بھی ہو تو اس صورت میں ۱/۲ سے علاوہ باقی بظاہر صواب پڑتا ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔
- (۱۰) تفہیمات کے لئے دیکھئے کتاب الموارث الاسلامیہ صفحہ ۱۲، صفحہ ۴۳، ۴۴
- (۱۱) بلکہ جو حضرات اس مسئلہ کے متعلق کل تک "خلافت قرآن" ہوئے سے فقہی ثبوت کے رہے تھے۔ خود ان پر بھی اصول نیابت ہی ثابت ہی نہ تھی بلکہ نوعیت واضح ہو گئی ہے اور خود بھی اس اصول کو صرف "نسبی رشتہ داروں" تک محدود کرنے کے قائل ہوئے ہیں۔ (دیکھئے طلوع اسلام ماہ مارچ ۱۹۵۴ء صفحہ ۵۸ تا ۶۰) حالانکہ یہ "نسبی" کی تخصیص جابجا ہو، یہ قرآنی بلکہ صحیحینا خلافت قرآن کے دیکھئے ضمیمہ الف کتاب ہذا صفحہ ۱۴۰-۱۴۳

(۱۲) جس طرح اخیانی بھائیوں کی وراثت کے متعلق فقہ فرائض میں ایک استثناء موجود

ہے دیکھئے کتاب ہذا صفحہ ۲۵

(۱۳) اس قسم کے استثناء ہیں صرف ”نسبی رشتہ داروں“ کو وارث بنانا اور بیوی یا ماں کو

نظر انداز کرنا صریحاً خلاف قرآن ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ لیکن

تعجب ہے کہ وہ لوگ جو اپنی فکر کی بنیاد صرف قرآن پر رکھنے کے مدعی ہیں وہ بھی

میاں بیوی جیسے تعلق وراثت کو۔ جو قرآن کا صریح حکم ہے اور دنیا بھر کے قوانین

وراثت میں اپنی نظیر آپ ہے۔۔۔ نظر انداز کرنے پر رضامند ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ

یہ ”اجتہاد“ سراسر خلاف قرآن ہے۔ اور محض جاہلانہ تحکم ہے۔ (میرا اشارہ رسالہ

طلوع اسلام ماہ مارچ ۱۹۵۴ (صفحہ ۵۸-۶۰) کی طرف ہے)

(۱۴) توضیحات کے لئے دیکھئے کتاب ہذا صفحہ ۱۰۸-۱۰۹



ضمیمہ الف

پنجاب اسمبلی کے اجلاس منعقدہ ۳ دسمبر ۱۹۵۳ء میں چودھری محمد اقبال صاحب چیمہ ایم ایل اے کی طرف سے ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا جس کا مقصد اسلامی قانون وراثت (پنجاب شریعت ایکٹ ۱۹۴۸ء) میں ایسی ترمیم کرنا ہے جس کی رو سے یتیم پوتوں کو بھی حصہ مل سکے۔ اگرچہ اصل مسئلہ پر اپنا نقطہ نظر ہم اصل مقالہ میں پیش کر چکے ہیں تاہم چونکہ چیمہ صاحب کا مجوزہ بل بھی ہمارے موضوع بحث سے خاص تعلق رکھتا ہے لہذا اس بل پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں تاکہ یہ بحث تشنہ تکمیل نہ رہ جائے۔

چیمہ صاحب کے مجوزہ ترمیمی بل کے وجوہ مقاصد یوں بیان کئے گئے

ہیں۔

”یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ اسلامی قانون وراثت کے لئے اصول نیابت بالکل اجنبی ہے۔ اس وقت مورث کی وفات سے پہلے مرنے والے بیٹے یا بیٹی اور بھائی یا بہن کی اولاد کو اس مورث کی جائیداد سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔ شریعت میں کوئی ایسی واضح ممانعت موجود نہیں ہے کہ یہ اشخاص مورث کی دوسری اولاد کی موجودگی میں محبوب الارث ہی سمہیں گے۔ قانون (وراثت) کا مروجہ نظریہ یتیم پوتوں پوتیوں، نواسوں، نواسیوں، بھتیجیوں، بھانجیوں وغیرہ کی زندگی بڑی اندوہناک بنا دیتا ہے۔ پس قانون کی اسلامی روح سے سازگار بنانے کے لئے یہ ترمیم تجویز کی جاتی ہے۔“

افسوس ہے کہ اس بیان میں بہت کچھ غلط مہیٹ کر دیا گیا ہے تاہم

مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) یہ محض خیال ہی نہیں حقیقت ہے کہ اصول قائم مقامی اسلامی قانون وراثت کے لئے واقعی اجنبی اور ناقابل عمل ہے (۱)۔

(۲) بھائی بہن کی اولاد کو بھی اس ترمیم سے مستفیض کرنا تعجب خیز ہے۔ اسلامی قانون وراثت ان کو اپنے ماں باپ کی جائیداد سے کب محروم کرتا ہے کہ ان کو بھی محبوب الارث کی صف میں لاکھڑا کر دیا جاوے۔۔۔۔۔ آخر مرحوم بیوی یا خاوند کے وارثوں کو بھی کیوں نہ اس ترمیم میں شامل کر لیا جائے؟

(۳) اگر شریعت تیرہ سو برس تک امت سے مخفی نہیں رہی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانون شریعت کی رو سے بیٹے بیٹی اور بہن کی اولاد اپنے سے اعلیٰ درجہ کے وارث کی موجودگی میں محبوب الارث ہی قرار دی گئی ہے چونکہ یہ اصول قائم مقامی کے بغیر وارث نہیں ہو سکتے اور اصول قائم مقامی پر عمل قرآن کے واضح احکام کو نظر انداز کئے بغیر ہو نہیں سکتا۔ لہذا محبوب الارث کا مسئلہ قرآن کا واضح حکم نہ سہی لیکن اس کے واضح احکام کی تعمیل کا لازمی تقاضا (Corollary) ضرور ہے۔

اگر یہ کہنے کی بجائے کہ ”شریعت میں کوئی ایسی واضح ممانعت موجود نہیں ہے کہ یہ اشخاص مورث کی دوسری اولاد کی موجودگی میں محبوب الارث ہی ٹھہریں گے۔“

۔۔۔ یوں کہا جاتا کہ ”چونکہ اسلامی قانون وراثت کی مخصوص وضع و مزاج کے باعث اصول قائم مقامی اس میں جاری نہیں ہو سکتا جس کی وجہ سے بعض محبوب الارث وارثوں اور خصوصاً یتیم پوتوں کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے لہذا ان یتامی کے معاشی مستقبل کی حفاظت و بہبود کے لئے۔۔۔۔۔ جو از روئے قرآن ضروری ہے۔۔۔۔۔ فلاں تجویز (مثلاً قانون وصیت یا حکومت کی کفالت یا ایک مخصوص استثناء وغیرہ) پیش کی جاتی ہے۔“

تو یہ کہنے میں البتہ کوئی بات بھی تھی جب آپ کے خیال میں شریعت میں ممانعت ہی نہیں تو یہ بل ہی کس لئے تجویز کیا گیا۔ تفسیر طبع کے لئے یہاں

زیر بحث پر آزیبل مسٹر جسٹس جے آر چمن صاحب جج ہائی کورٹ لاہور (Hon`ble Mr.Justice J.Orcheson) کی رائے جو انہوں نے بحیثیت ایک فاضل قانون دان ہونے کے ظاہر کی ہے۔۔۔ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"In my opinion if the principle laid down in the bill is in accordance with the Shariat, it is unnecessary, or if it is against the Shariat, it is invalid."(2)

یہ تو بل کے اغراض و مقاصد پر تبصرہ تھا۔ اب ذرا اصل مطلوبہ ترمیم ملاحظہ فرمائیں:-

--- "جب کوئی بیٹا بیٹی یا بھائی یا بہن اپنے مورث سے وراثت پانے سے پہلے فوت ہو جائے۔۔۔ تو ان کا حق وراثت بوقت تقسیم وراثت مورث ان (فوت شدہ) کے اپنے "جانشینوں اور وارثوں" کی طرف منتقل کیا جائے گا (اور یہ سمجھ لیا جائے گا) کہ گویا اشخاص متذکرہ بالا اپنے مورث (آخری مالک) کی وفات کے فوراً بعد مرے تھے۔"

مقالہ کے حصہ دوم کے مطالعہ کے بعد ان غلط فہمیوں اور مشکلات و مفادات کا دریافت کر لینا دشوار نہیں ہے جو یہ ترمیم اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے (۳)۔ دراصل یہ ترمیم بالکل اسی اصول پر مبنی ہے جس سے ہم مفصل بحث کر چکے ہیں (۴)۔ یعنی یہ کہ "ہونے والے وارثوں" کی موت کی صورت میں ان کا حصہ ان کے اپنے وارثوں اور جانشینوں کو منتقل کر دیا جائے۔۔۔ البتہ ان "ہونے والے وارثوں" میں سے صرف بیٹا بیٹی بھائی بہن منتخب کئے گئے ہیں معلوم نہیں والدین اور زوجین کو کیوں اس رعایت سے محروم کیا جا رہا ہے؟

دراصل ترمیم میں "کوئی بیٹا یا بیٹی" اور "ان کے جانشینوں اور وارثوں" کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ محرک اور مجوز کے ذہن میں وارث اور جانشین کا مطلب اولاد اور صرف اولاد ہے۔۔۔ (جو خالص ہندو نظریہ ہے) قرآن حکیم کے

چھ بنیادی وارثوں (بیٹا بیٹی ماں باپ بیوی خاوند) کو ذہن میں رکھنے کے بعد اس ترمیم کے مہمل، ناقابل عمل اور قرآن کے واضح اور ظاہر احکام میراث سے لاعلمی پر مبنی ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہ جاتا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اس ترمیم کے الفاظ میں ترمیم کر کے اسے اس قسم کے استثناء کی شکل دی جائے جس کا ذکر مقالہ کے صفحہ ۱۰۳ پر ہو چکا ہے۔ لیکن بہر حال پھر بھی یہ اس مسئلہ کا تسلی بخش حل نہیں ہوگا اور فوائد سے زیادہ اس میں خطرات و مفسدات مضمحل ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اس قسم کے استثناء کی ضرورت بھی اس وقت درپیش آسکتی ہے (۵) جب قانون وراثت، قانون ہبہ اور قانون وصیت تینوں نافذ ہوں اور پھر بھی کچھ ایسے واقعات (Cases) سامنے آئیں جسے کسی خاص ”آسانی افتاد“ نے ان تمام قوانین سے متمتع نہ ہونے دیا ہو۔ اور پھر ”ایسی مخصوص صورتوں“ کے حل کے لئے بھی یہ سوچا جائے گا کہ اس میں سب سے پہلے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو اسلام کی نظروں میں زیادہ ضروری ہے مثلاً حکومت کی کفالت --- اور اگر اس بہتر طریقہ کے اختیار کرنے میں کوئی قابل قبول عذر اور مجبوریاں موجود ہوں تب اس صورت میں بے شک اس قسم کے استثناء کو زیر غور لایا جاسکتا ہے اور جائز بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن جو سب سے آخر کی چیز ہے اسے سب سے پہلے لانا سراسر تحکم اور نادانی ہے۔ اسلامی احکام و مسائل پر بحث کرتے وقت ضد، ہٹ دھرمی اور فتح و شکست کے نظریوں سے سوچنے کی بجائے تقویٰ، خوف خدا، اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احترام دین کے جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔

(اس کے بعد آگے ضمیمہ ب ضرور ملاحظہ فرمائیں)

ضمیمہ ب

اگرچہ مقالہ ”یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ“ خالص علمی ضرورت اور مقصد کے ماتحت لکھا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بحث ایک خالص قرآنی حکم سے متعلق تھی۔ اس لئے بحیثیت ایک طالب علم کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک مسلمان کے۔۔۔ اور دراصل سب حیثیتوں سے مقدم یہی حیثیت ہے۔۔۔ یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ جب سے میں نے اس مسئلہ کی تحقیقات اور اسے سمجھنے کی کوشش شروع کی تھی۔ میں اپنی اکثر نمازوں کے ساتھ بالالتزام اللہ تعالیٰ سے بصدق دل دعا مانگتا رہا ہوں کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق راہ حق اور صورت صواب پر میرے دل کو مطمئن کر دے۔ اس دوران میں بار بار میری رائے بدلتی بھی رہی ہے۔ لیکن بالآخر مسلسل مطالعہ ذاتی بحث و مباحثہ اور آزادانہ غور و فکر کے بعد میں نے اس مسئلہ کے متعلق مختلف آراء کا تجزیہ کر کے جو کچھ شرح صدر کے ساتھ سمجھا ہے اسے مقالہ میں پیش کر دیا ہے۔۔۔ اپنی بساط بھر پوری علمی سعی و کوشش اور اپنی پر خلوص دعاؤں کے بھروسے پر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے گمراہی سے محفوظ رکھا ہو گا۔ تاہم میں یہی کہتا ہوں کہ اگر میں نے حق سمجھا اور کہا ہے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کی مہربانی ہے۔۔۔ اور اگر خدا نخواستہ میں نے کوئی غلط رائے قائم کی ہے یا غلط بات بیان کی ہے تو وہ میری طرف سے ہے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ اور اس کے لئے اہل حق و ہدایت سے اصلاح کا اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور عفو کا طلبگار ہوں۔

”ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا وھب لنا من لدنک رحمة انک

انت الوھاب“

حواشی اور حوالہ جات

- (۱) دیکھئے کتاب ہذا کا صفحہ ۸۲-۸۳
- (۲) پنجاب مقننہ (۱ سبلی) کی طبع کردہ پبلک آراء اس مسئلہ پر (انگریزی میں) صفحہ ۲
- (۳) اس ضمن میں "Opinion" یعنی "پنجاب" مقننہ کی طبع کردہ پبلک آراء میں آنریبل جسٹس کیکاؤس (صفحہ ۱) چوہدری فضل حق سیشن جج کیمپلپور (صفحہ ۷۵) اور سینئر سول جج مظفر گڑھ (ضمیمہ آراء صفحہ ۷۳-۷۵) کی آراء قبل ملاحظہ ہیں
- (۴) کتاب ہذا صفحہ ۱۶
- (۵) اور اس قسم کے استثناء کو ہر صورت میں اور ہر قیمت پر ناجائز کہنا اور مطلقاً اس کے تصور کو ہی سراسر خلاف قرآن سمجھ لینا۔۔۔ بھی روح قرآن و اسلام سے بے خبری ہے۔ کیونکہ کسی ایسے مقصد شرعی کی حفاظت کرنا جس کا مقصد شرعی ہونا کتاب و سنت یا اجماع سے معلوم ہو اور اس کا مقصود ہونا دلائل کے مجموعہ و قرآن حالات سے معلوم ہو تو اس کی پیروی کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے یہی موائک کا استصلاح اور احناف کا استحسان ہے۔ اور متذکرہ بالا شرائط کے ساتھ یتیم کا مسئلہ یقیناً ایک "مقصد شرعی" بن جاتا ہے۔



ضمیمہ ج

یہ مقالہ ۵۲-۱۹۵۳ء میں ایم اے ”اسلامیات“ کے ایک پرچے کے طور پر امتحانی ضرورت کے ماتحت لکھا گیا تھا۔ آج چالیس برس کے بعد شائع کرتے وقت اسے ”تازہ ترین“ (Up-to-date) کرنے کے لئے بعض وضاحتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو معمولی وضاحتیں ہیں جن کو اصل مقالہ میں تعلیقات و حواشی کی شکل میں بھی جگہ دی جاسکتی تھی۔ لیکن علمی دیانتداری کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا کہ مقالے کو تو (بعض منشیانہ اغاٹ کی درستی کے علاوہ) جوں کا توں ہی چھاپا جائے۔ یہ راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے اور اس میں عبارت اور اسلوب کی بعض طالب علمانہ خامیاں موجود ہیں (مثلاً کئی جگہ ضمیر واحد متکلم کا استعمال یا طریق حوالہ میں بعض کوتاہیاں) تاہم ان سے اصل نفس مقالہ پر اس کے استدلال اور طریق استنباط پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

☆ ان معمولی ایک دو سطری وضاحتوں کے علاوہ بعض ایسی اضافی معلومات ہیں جن کا تعلق مقالہ ہی کے کسی حصے سے ہے۔ تاہم اس معلق یا ضمیمہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء سے اب تک یہ مسئلہ (جو موضوع مقالہ ہے) ان مسائل میں شامل رہا ہے جو ہماری دینی اور سیاسی زندگی میں اضطراب اور بیجان کا باعث رہے ہیں۔ لہذا ”تکملہ“ کے طور پر اس مسئلہ کے بارے میں مختلف تبدیلیوں اور تغیرات (Developments) کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو اس عرصے میں سامنے آئیں۔ تفصیل ان وضاحتوں، اضافوں اور تکملہ کی یوں ہے:-

☆ مقالہ کے مقدمہ میں شعبہ علوم اسلامی (ابتداء میں شعبہ کا سرکاری نام بھی ”اسلامیات“ ہی تھا۔ اس زمانے کے یونیورسٹی کیانڈر اور ہماری اسناد میں یہی

نام درج ہے بعد میں اس کا انگریزی نام ”اسلامک سٹڈیز“ رکھا گیا جس کا ترجمہ عموماً ”علوم اسلامیہ“ کیا جاتا ہے۔ ویسے ”علوم اسلامی“ زیادہ خالص فارسی ترکیب ہے۔) کی ”مختصر مگر جامع“ لائبریری کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ شعبہ کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ اس کی بنیاد ہمارے قابل صد احترام استاد اور صدر شعبہ علامہ علاؤ الدین صدیقی رحمہ اللہ نے ۱۹۵۰ء میں رکھی تھی (جن کو راقم نے مقدمہ مقالہ میں ”مدظلہ“ لکھا ہے اور جن کی وفات ۱۹۷۸ء میں ہوئی)۔ اس وقت شعبہ اولڈ کیمپس میں واقع موجودہ فائن آرٹس کے شعبہ کے دو کمروں میں قائم تھا اور شعبہ کی لائبریری واقعی بہت ”مختصر“ مگر جامع تھی۔ علامہ صاحب کے ذوق انتخاب نے اس لائبریری کو بڑی وسعت دی۔ ۱۹۶۱ء میں جب شعبہ اولڈ کیمپس میں ہی اپنی نو تعمیر کردہ عمارت میں منتقل ہوا تو یہ لائبریری خاصی بڑی ہو چکی تھی۔ ۱۹۸۷ء سے شعبہ شیخ زاید اسلامک سنٹر (نیو کیمپس) کی شاندار عمارت میں بطور ادارہ (Institute) کام کر رہا ہے اور اس کی لائبریری لاہور کی بہترین لائبریریوں میں شمار ہوتی ہے اور ہمارے استاد محترم کے ہاتھ کا لگایا ہوا یہ پودا آج ”اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء“ کا ایک منظر ہے۔

☆ مقالہ میں کئی جگہ اسلامی تاریخ کی تیرہ صدیوں یا ساڑھے تیرہ صدیوں کا ذکر آیا ہے۔ اب ہجری تاریخ کے لحاظ ۱۴۱۳ھ ہے۔ مقالہ آج سے چالیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔

☆ مقالہ میں بعض مقامات کے پرانے (اس زمانے والی) نام لکھے گئے ہیں مثلاً منگمری (جو اب ساہیوال کہلاتا ہے) اور کیمبل پور (جو اب اٹک ہے)۔ ان مقامات کے نئے نام وہی ہیں جو دراصل انگریزوں سے پہلے انکے نام تھے۔

☆ رسالہ ”طلوع اسلام“ کا ذکر مختلف حوالوں سے کراچی سے شائع ہونے والے رسالے کے طور پر آیا ہے۔ غالباً ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ یہ ادارہ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور میں آگیا تھا اور یہ رسالہ اب یہاں سے نکلتا ہے۔ اس کے بانی مدیر

غلام احمد پرویز صاحب تھے۔

☆ ہمارے اس مقالہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صورت مسئلہ پر فقہ حنفی اور فقہ جعفری (سنی شیعہ) ہر دو کے موقف اس کی بنیاد اور ان کے طریق استدلال سے بحث کی گئی ہے۔ اس پر سنی شیعہ اختلاف کے ساتھ ساتھ ایسی مثالیں (وراثت کی) بھی پیش کی گئی ہیں۔ جہاں طریق استدلال کے فرق کے باوجود نتیجہ (حل مسئلہ) ایک ہی نکلتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مقالہ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کو اس مسئلے پر ایک دوسرے کا موقف سمجھنے میں مدد دے گا۔ بلکہ اس سے اس مسئلہ پر امت کے اتفاق اور اجماع کی وجہ بھی معلوم ہوگی۔

☆ راقم الحروف نے مقالہ کے مقدمہ میں اس مسئلہ پر تحقیق کا محرک تو تحصیلدار صاحب والا واقعہ بیان کیا ہے۔ تاہم جب میں مقالہ لکھنے کے لئے اور اپنے ذہن کو آمادہ کرنے کے لئے ابتدائی مطالعہ میں مصروف تھا اور مسئلہ کے "قدیم پہلو" (یعنی فقہائے متقدمین کے مطابق صورت مسئلہ کے فہم) کو واضح کرنے کی کوشش میں لگا تو مجھے اس کے لئے شیعہ سنی ہر دو کی فقہ فرائض کے مطالعہ کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اپریل ۱۹۵۲ء کے ترجمان القرآن میں مولانا مودودی صاحب مرحوم و مغفور نے یتیم پوتے کے محبوب الارث ہونے کی شرعی حقیقت پر ایک استفسار کے جواب میں لکھ دیا کہ "۔۔۔ یہ مسئلہ فقہاء اسلام میں متفقہ چلا آتا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا۔۔۔ الخ" مولانا مرحوم کا یہ لکھنا شیعہ فقہ فرائض سے علمی پر مبنی تھا۔ چنانچہ ان ہی دنوں حافظ کفایت حسین صاحب مجتہد مرحوم نے بذریعہ اخبار مودودی صاحب مرحوم کے اس "الزام" کی تردید کی اور بتایا کہ "شیعہ کے مطابق تو پھوپھی بھی اپنے یتیم بھتیجے کو محبوب کرتی ہے" مقالہ نگار نے اس سلسلے میں حافظ صاحب مرحوم سے ان کے گھر پر ملاقات کر کے ان سے اس مسئلہ پر شیعہ موقف سمجھنے کے لئے اہم کتابیات کی فہرست بھی لی تھی۔ مقالہ کے حصہ اول خصوصاً

باب پنجم ”مقام حیرت“ کے مطالعہ سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ غالباً اس مسئلہ پر شیعہ سنی (بلکہ پوری امت کے) موقف کی یکسانیت کا یہ ”بارگراں“ ہی مجددین حضرات کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

☆ مولانا حافظ اسلم جے راجپوری صاحب کے مقالہ ”محبوب الارث“ کے جون جولائی ۱۹۸۱ء کے رسالہ معارف اعظم گڑھ میں اور پھر ادارہ طلوع اسلام کی کتاب ”تین اہم مسائل“ میں شائع ہونے کا ذکر مقالہ میں ہوا ہے۔ اس کے بعد پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی اس مسئلہ پر شائع کردہ پبلک آراء (Opinions) میں بھی یہ مقالہ ”ادارہ طلوع اسلام“ ہی کے ایک وضاحتی مضمون کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ پھر یہی مقالہ ”ادارہ طلوع اسلام“ ہی کے ایک وضاحتی مضمون کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ پھر یہی ہفت روزہ ”چٹان“ ۷ اور ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع کرایا گیا تھا۔ (یہ اشاعتی حوالے اس لیے دیئے گئے ہیں کہ جو حضرات اس کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو اس کے حصول میں آسانی ہو) جیراچپوری صاحب نے اپنے اس مقالہ میں یتیم پوتے کے محبوب الارث ہونے کے مسئلہ کے علاوہ حنفی فقہ فرائض پر کچھ مزید اعتراضات بھی کئے ہیں (مودودی صاحب مرحوم کی طرح غالباً جیراچپوری صاحب کی نظر بھی جعفری فقہ فرائض پر نہیں تھی۔ جس کا ثبوت ان کا ”دادا کا اپنے پوتے کا وارث بننا“ والی مثال پیش کرنا ہے۔ جو شیعہ کا موقف نہیں ہے)۔ مولانا جیراچپوری صاحب کے اس مقالہ میں جتنا حصہ ”یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ“ سے متعلق تھا۔ اس پر ہم مقالے میں بحث کر چکے ہیں (دیکھئے مقالہ کا دوسرا حصہ باب دوم) باقی مسائل ہمارے لئے غیر متعلق تھے۔ اس لئی ہم ان کی تفصیل میں نہیں گئے تھے۔ البتہ مختصراً ان مسائل میں بعض کلیات کے متصادم ہونے یا ان کے مختلف مذاہب فقہ کے درمیان تنازعہ فیہ ہونے کا ذکر کر دیا تھا (دیکھئے مقالہ کے دوسرے حصے میں باب دوم کی فصل اول) مولانا جیراچپوری صاحب کا یہ مقالہ بڑے علمی اور فقہی انداز میں لکھا گیا ہے لہذا اہل علم حضرات کے پڑھنے اور غور

کرنے کی چیز ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اہل علم کس طرح غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں اور کس طرح مغالطے دیتے ہیں۔

☆ مقالہ میں ”سید غلام احمد بی اے پلیڈر منسٹری“ کے مختصر سے پمفلٹ ”یتیم پوتے کا حق وراثت“ کا ذکر آیا ہے۔ کتابیات میں بھی اور ایک دو نکات کی عمدہ وضاحت کے ضمن میں بھی مقالہ کے اندر بطور حوالہ بھی --- بعد میں سید صاحب گوجرانوالہ میں ”سید غلام احمد رضوی ایڈووکیٹ“ کے معروف نام اور لقب سے پریکٹس کرنے لگے۔ انہوں نے محمد اقبال چیمہ صاحب کے مجوزہ ترمیمی بل (جس کا ہمارے مقالہ میں بھی ذکر آیا ہے) کے علاوہ --- اس زمانے میں اس موضوع پر اخبارات میں شائع ہونے والے بعض مضامین (اور خطوط) کے جواب میں بھی مضمون لکھے (جو اخبارات میں بھی چھپتے رہے) اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے مولانا اسلم جیراجپوری صاحب کے مقالہ ”محبوب الارث“ میں بیان کردہ تمام مثالوں سے مفصل بحث کی ہے (جن سے ہم نے موضوع مقالہ سے غیر متعلق ہونے کی بناء پر تعرض نہیں کیا تھا) اور ان مثالوں میں پوشیدہ غلط فہمیوں کو واضح کاف کیا ہے اور یہ جیراجپوری صاحب کے مقالہ کا نہایت عمدہ قانونی اور فقہی محاسبہ ہے۔ سید غلام احمد صاحب کے یہ جملہ ”مضامین“ اب کتابی شکل میں اپنے اسی ابتدائی عنوان ”یتیم پوتے کا حق وراثت“ کے ساتھ انجمن خدام القرآن ماڈل ٹاؤن لاہور نے شائع کر دیئے ہیں۔ احقاق حق اور طلب تحقیق کا تقاضا ہے کہ اہل علم ان دونوں رسالوں کا مطالعہ کریں۔ یہ تقابلی مطالعہ مسئلہ کی تہ تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوگا اور ان کے مطالعہ کے لئے ہم نے ”اہل علم“ کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ یہ دونوں رسالے فنی اور قانونی ہیں لہذا وہ ”مطلق“ کی نڈل میزک پاس ”عوامی“ کے پڑھنے کی چیز نہیں ہیں۔ فقہ اور قانون سے واقف آدمی ہی ان دونوں کتابچوں کو پڑھ کر خطا اور صواب میں تمیز کر سکتا ہے۔

☆ مقالہ کے دوسرے حصے کے باب سوم میں ”وجوب وصیت“ اور ”آیضاً

الوصیۃ“ کے نسخ اور عدم نسخ پر بات کی گئی ہے۔ یہاں اس مضمون کو ایک عملی مثال کے ذریعے سمجھانے کے لئے مندرجہ ذیل معلومات کا اضافہ مناسب معلوم ہوتا ہے:-

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے ”الفوز الکبیر“ میں نسخ فی القرآن پر بحث کرتے ہوئے ایسوی کی ”الاتقان“ کے حوالے سے لکھا کہ انہوں نے ۲۱ آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے تعقبات کئے اور ۱۵--۱۶ آیات (ناسخ منسوخ) میں تطبیق کی صورت پیدا کر دی اور صرف پانچ آیات کو ”واقعی منسوخ“ قرار دیا۔ ان میں سے ایک یہ آیت الوصیۃ (البقرہ: ۱۸۰) بھی ہے۔ ہمارے استاذ مکرم علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم اپنے استاذ مولانا احمد علی لاہوری کے حوالے سے بیان کرتے تھے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے ان پانچ آیات میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر دی تھی اور یوں ان کے نزدیک قرآن کریم کی کوئی آیت نسخ کی اصطلاحی تعریف (کسی حکم کا ہمیشہ کیلئے ہر شخص کے لئے ختم ہو جانا) کے لحاظ سے منسوخ نہیں ہے۔۔۔ مولانا سندھی کہتے تھے کہ ”باقی لوگوں کے لئے وصیت کرنا واجب ہے۔۔۔“ مولانا ایک سکھ کنبہ سے مسلمان ہوئے تھے مگر ان کی والدہ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی والدہ کو بڑے احترام سے ساتھ رکھتے تھے بلکہ انہوں نے اپنی والدہ کی فرمائش پر مولانا احمد علی لاہوری کو (جو مولانا سندھی کے عزیز اور تلامذہ میں سے بھی تھے) ”ہر دواریاترا“ کے لئے اپنی والدہ کے ہمراہ بھیجا تھا۔۔۔ اب چونکہ ان کی والدہ غیر مسلم ہونے کے باعث بیٹے کی وراثت سے حصہ نہیں پاسکتی تھیں۔ اس لئے مولانا سندھی اس آیت کی رو سے اپنے لئے وصیت برائے والدہ واجب سمجھتے تھے اور بات بھی درست تھی۔

☆ اب ہم مقالہ کے ”تکملہ“ کے طور پر ان حالات و واقعات اور قانونی اقدامات کا ذکر کریں گے جو ۱۹۵۳ء کے بعد سے اب تک ظہور پذیر ہوئے اور جن کا ”یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ“ سے تعلق ہے۔

باب ۸ ۱۹۳۸ء میں

West Panja

Act. (Act IX

کے اندر ترمیم کے

حکث کر چکے ہیں۔

اد کیلئے اپنے تعلیم

ہے کیونکہ اس کا

منظر " کے مسودہ

وراثت کا مسئلہ "

سے اس مسئلے کے

وابستہ رہتی ہے۔

کے استحصال اور اشتعال کا ایک نہایت کارگر حربہ ثابت ہو سکتا تھا (اور ہوا) آخر کیونز م بھی تو ”بیچارے“ محنت کشوں اور ”مظلوم“ مزدوروں کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لئے ہی اٹھا اور چھا گیا تھا اور ستر سال تک ایسا چھایا رہا کہ پھر کسی بھوکے کو رونے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔

بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اب ہم اپنے موضوع یعنی پاکستان میں ”یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ“ پر بحث مباحثہ اور قانون سازی وغیرہ سے متعلق گزشتہ چالیس برس کے واقعات اور اقدامات کا ذکر کریں گے۔

☆ ربط مضمون کے لئے بات دسمبر ۱۹۵۳ء سے شروع کرنا مناسب ہے جس کا کچھ حصہ پہلے مقالہ میں مذکور ہوا تھا۔۔۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں چوہدری محمد اقبال چیمہ صاحب نے پنجاب اسمبلی میں جب اپنا ترمیمی بل (بل نمبر ۸ سال ۱۹۵۳ء) پیش کیا تو اسمبلی نے اس مسئلہ پر صوبہ کے تمام اعلیٰ ججوں، سرکاری محکموں کے سربراہوں، ڈسٹرک اینڈ سیشن ججوں، سول ججوں، ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے ضلعی افسروں، میونسپل کمیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں (جو اب ڈسٹرکٹ کونسل کہلاتے ہیں) پبلک تنظیموں، انجمنوں، اداروں اور دینی مدرسوں کے علاوہ پبلک سے انفرادی آراء بھی طلب کیں۔ یہ آراء (جن کے مقالہ میں حوالے بھی ہیں) ۱۲ صفحہ کے ایک ضمیمہ (Supplement) سمیت کل ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ایک ”رجسٹر نما“ کتاب کی صورت میں ۱۷ فروری اور ۲۲ فروری ۱۹۵۴ء کو شائع کی گئی تھیں۔ ان آراء کا مطالعہ (جو بعض اردو میں ہیں اور بعض انگریزی میں) اپنی اندر عبرت اور موعظت کا سامان رکھتا ہے۔ ان میں نہایت سنجیدہ اور قابل قدر علمی آراء بھی ہیں اور انتہائی جاہلانہ اور بعض ”فدویانہ“ آراء بھی ہیں۔ آج کل یہ مطبوعہ آراء کہیں نہیں مل سکتی ہوں گی (غالباً پنجاب اسمبلی کی لائبریری یا بعض دیگر معیاری لائبریریوں میں موجود ہوں گی) کیونکہ اس پر ”صرف ارکان اسمبلی کے استعمال کے لئے“ لکھا گیا تھا۔ ان آراء کے مطالعہ سے بے اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث

”کھلونا“ یا شوشہ (Issue) ثابت ہوا۔ اپوزیشن اسے اپنے سیاسی فوائد کے نقطہ نظر سے دیکھنے لگی اور سرکاری پنچ اپنے مفادات اور اپنی برتری کے نقطہ نظر سے --- اب سوال حق و باطل اور خطا و صواب کا نہیں بلکہ ہار اور جیت کا تھا۔

☆ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ پاکستان کے اس وقت کے وزیراعظم محمد علی بوگرا صاحب نے اپنی بیوہ حمیدہ بانو کے ہوتے ہوئے اپنی ایک عرب نژاد سیکرٹری عالیہ سے شادی کر لی۔ ان کے سیاسی حریفوں کو وزیراعظم پر تنقید کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ مغرب گزیدہ حلقوں نے بھی مخالفوں کا ساتھ دیا اور لیڈر ٹائپ خواتین کو عورت کی مظلومیت کا رونا رونے کا خوب موقع ملا۔ ان واقعات کے پیش نظر حکومت پاکستان نے ۴ اگست ۱۹۵۵ء کو ایک ”شادی اور عائلی قوانین کا کمیشن“ مقرر کیا جس کا سرکاری نام تھا:

"Comission on Marriage and Family Laws"

اور جسے ہم آئندہ مختصراً ”عائلی کمیشن“ ہی کہیں گے۔ اس کے پہلے صدر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم نامزد ہوئے تھے اور ارکان میں تین مرد اور تین خواتین تھیں مرد اراکین میں ایک عالم دین مولانا حشام الحق تھانوی مرحوم شامل تھے۔

☆ اس کمیشن نے ایک سوالنامہ تیار کیا جو اردو، انگریزی اور بنگالی میں شائع کرایا گیا اور دانشوروں، علماء اور عوام سے اس سوالنامہ کی روشنی میں آراء طلب کی گئیں۔ کمیشن نے ۹ موضوعات پر پچاس کے قریب سوالات مرتب کئے تھے۔ ان میں سے باقی سوالات کا تعلق تو نکاح، طلاق وغیرہ سے تھا۔ ہمارے موضوع سے متعلق اس میں یہ چیز تھی کہ وراثت اور وصیت سے متعلق پانچ سوال بھی اس سوالنامہ میں شامل تھے۔ ان میں سے بھی تین سوالات کا تعلق تو عدالتی طریق کار سے تھا۔ البتہ دو سوال براہ راست قانون وراثت سے متعلق تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ”کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ اگر پاکستان کے کسی حصے میں ابھی تک قانون وراثت اور وصیت کے بارے میں شرعی قوانین پر عمل نہیں ہو رہا تو بلا تاخیر

یہ قانون اختیار کیا جا کہ اس بارے میں تو اسے تو میں ملاحظہ کرنا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے اس سوال کے جواب میں آپس میں تو اسے تو میں ملاحظہ کرنا ہے۔
 ہرگز نہیں جیسا کہ تم نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے۔ سوال تو اس وقت تک نہیں
 قانون عدالت کا جب تک عدالت نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔
 کے مسائل کا ہیبت عمداً اور جب سوال میں فقہاء نے یہ تصور کیا ہے کہ اسے
 کے لیے سفارشات میں اس میں اس سوال "حق" یا "قرب" سے اس کے جواب میں
 صیغہ استعمال ہے۔

اس میں آپس کے اس سوال میں غیر سوال یہ ہے۔ اس میں اسے تو میں ملاحظہ کرنا ہے۔
 میں نص صریح موجود ہے۔ یہ اگر صحیح حدیث میں یہ فقہاء میں سے کہ نہیں ہے،
 پھر یہ نو سے یہ نو کو محرم الہرت کر دیا جائے۔

اس سوال کا تعلق برادری سے ہے نہ یہ بحث مسک سے تو اسے تو میں ملاحظہ کرنا ہے۔
 کی عبارت یہ تو اس قسم کی فقہ فہمی پر مبنی ہے جس میں ہمارے تفسیر سے اس
 بتلائے (دیکھئے مقالہ کے مقدمہ) اور یہ پھر یہ ایک منطقی مفہم (اور اس وقت تک)
 مبنی ہے جسے کے مناظروں میں فریق ہونی کو ترجیح کرنے کے لئے کٹا ستور کر دیا
 ہے اور جس سے بعض دفعہ دکھاء بھی کسی عدالتی اور قانونی چار میں کام لیتے ہیں۔
 بعض سوالوں کے جواب دو ٹوک (Categorically) "ہاں" یا "نہیں"
 میں (غیر مشروط طور پر) نہیں دیئے جاسکتے۔ ذرا تفصیل درکار ہوتی ہے۔ یہ اس
 طرح کا سوال ہے جیسے آج کل بعض مے خوار "مسلمان" یہ کہتے ہیں کہ "یہ
 قرآن میں کہیں شراب کو صریحاً (وہی نص صریحاً) "حرام" کہا گیا ہے۔ اسی طرح
 جو لوگ فقہ دین کے لئے حدیث یا سنت کی ضرورت کے منکر ہیں ان سے پوچھا
 جاسکتا ہے کہ "کیا قرآن کریم میں کتے یا بندر (وغیرہ) کے گوشت کی حرمت پر
 کوئی نص صریح موجود ہے؟" (جس طرح خنزیر کے بارے میں ہے) اگرچہ یہ

حرمیں صرف قرآن سے بھی ثابت کی جاسکتی ہیں مگر ذرا تفصیل میں جا کر ---
مندرجہ بالا سوالوں کا دو ٹوک جواب دیکر نہیں۔

جس طرح ریاضی (الجبرا جیومیٹری وغیرہ) کے مسائل کے ثبوت میں
ایک مسئلہ ثابت کرتے ہوئے کوئی دوسرا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔
(بعض دفعہ)۔ اسی طرح قانونی (فقہی) احکام میں بھی بعض چیزیں براہ راست نہیں
بلکہ کسی صریح حکم کے نفاذ یا اس پر عمل کا لازمی نتیجہ اور صریح تقاضا
(Corollary) ہوتی ہیں۔ ہم مقالہ میں اس پر بحث کر چکے ہیں کہ ”یتیم پوتے کا
محبوب الارث ہونا لازمی نتیجہ ہے قرآن کے قانون وراثت میں اصول نیابت کے
بطور قاعدہ کلیہ کے ناممکن العمل ہونے کا“ (دیکھئے اصل مقالہ کا حصہ دوم باب
پنجم)

اس قسم کے سوال مرتب کرنے والے (ذہن) کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ
اگر کوئی اس کا جواب یہ دے کہ ”صریح حکم تو نہیں مگر ---“ تو اسے کہہ دیا
جائے ہمیں صرف یہی ”نہیں“ مطلوب تھی باقی ”اگر مگر“ کی ضرورت نہیں (۱)
☆ بہر حال اس سوالنامہ کے جوابات موصول ہونے پر کمیشن نے حکومت کی
جو سفارشات پیش کیں اس میں کہا گیا تھا کہ ”کمیشن کی رائے میں یتیم پوتا اپنے دادا
کی وراثت میں برابر کا حقدار ہے اس کو اس حق سے ہرگز محروم نہیں کیا جاسکتا“
مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے ان سفارشات پر (باقی سفارشات کا تعلق تو
نکاح طلاق ازدواج وغیرہ سے تھا) اپنا طویل وضاحتی اختلافی نوٹ لکھا تھا اس میں
اس مسئلہ پر بھی ان کا موقف فقہاء متقدمین والا ہی تھا۔۔۔ انہوں نے کمیشن کی
سفارشات کو من حیث المجموع ”افتو منون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض“
کی عملی تفسیر قرار دیا تھا۔ کمیشن کی اصل رپورٹ کا گزٹ نوٹیفیکیشن ۲۰ جون ۱۹۵۶ء
کو آیا تھا۔ جبکہ مولانا تھانوی کے اختلافی نوٹ (جو خاصا طویل تھا) کا گزٹ ۳۰ جون
۱۹۵۶ء کو آیا۔ اس کے چھاپنے میں یہ تاخیر خود حکومت نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر کی

تھی۔

عالمی کمیشن کی سفارشات سامنے آئیں تو علماء کی اکثریت اور ان کے تابع اثر عوام کی طرف سے شدید رد عمل بھی سامنے آیا۔ حکومت ان سفارشات کو قانوناً نافذ کرنے کی جرات نہ کر سکی (حکومت کا سیاسی عدم استحکام بھی اس کا باعث بنا) اس کی بجائے حکومت نے ٹالنے اور وقت گزارنے کے لئے ایک ”اسلامک لاء کمیشن“ قائم کیا ”جو عالمی سفارشات کا بھی جائزہ لے گا۔“ اس کمیشن کا ابھی شاید ایک آدھ اجلاس ہی ہوا تھا کہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جنرل ایوب خان آئین اور جمہوریت کی بساط لپیٹ کر بذریعہ مارشل لاء ملک پر مسلط ہو گئے۔

☆ مارشل لاء کے ابتدائی دنوں میں کمیشن کی سفارشات سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ چونکہ آئین ہی منسوخ کر دیا گیا تھا لہذا یہ سمجھا گیا کہ شاید یہ سفارشات بھی کالعدم ہو گئی ہوں گی۔ تاہم ۱۹۵۹ء میں ”اپوا“ (انجمن بیگمات پاکستان) کی طرف سے عالمی کمیشن کی سفارشات کو عملاً (قانوناً) نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جس کی تجدید پسند حلقوں اور جراند نے بھی حمایت کی۔۔۔ ایوب خان خود بھی بے دین (Secular) ذہن رکھتے تھے اور شاید کمال پاشا کی طرح وہ تجدید کا تاج بھی اپنے سر پر رکھنا چاہتے تھے۔ بہر حال ”اپوا“ کے اس مطالبے کے پیش نظر ۲ مارچ ۱۹۶۱ء کو ”مسلم فیملی لاز (عالمی قوانین) آرڈی نینس کی صدارتی حکم جاری ہوا۔ جس میں کمیشن کی سفارشات کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔ اس کا پورا سرکاری نام

(Muslim family laws ordinance (VIII of 1961) ہے۔ بعض انتظامی

امور کی وجہ سے اس کا نفاذ موخر کر دیا گیا۔ بالآخر آرڈینینس کا عملاً نفاذ ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء سے ہوا۔ اس وقت سے اب تک یہ قوانین پاکستان میں جاری چلے آتے ہیں۔

☆ اس آرڈی نینس کی دفعہ نمبر ۴ میں یتیم پوتے کی وراثت کا قانون حسب

ذیل الفاظ میں بیان ہوا ہے:

4 Succession- In the event of the death of any

son or daughter of the propositus before the opening of succession, the children of such son or daughter, if any, living at the time the succession opens, shall per stirpes receive a share equivalent to the share which such son or daughter, as the case may be, would have received, if alive.

جس کا اردو ترجمہ (جو عدالتوں اور وکلاء کے لئے سند ہے) یوں کیا گیا ہے:

”وراثت کے اجراء (شروع ہونے) سے قبل مورث کے کسی بیٹے یا بیٹی کی موت کی صورت میں ایسے بیٹے یا بیٹی کی اولاد، اگر ہو، جو وراثت شروع ہونے پر زندہ ہوں بحصہ رسدی (علی المنسب) اس حصہ کے برابر پائیں گے جو ایسا بیٹا یا بیٹی اگر زندہ ہوتے تو پاتے۔“

ہم اس دفعہ کے الفاظ کے انتخاب، ان کے قانونی مضمرات اور قانون کی قرآن سے مخالفت وغیرہ پر آگے چل کر تبصرہ کریں گے۔ پہلے ذرا ہم اس مسئلہ کی بلکہ قانون کی) سیاسی تاریخ کو مکمل کر لینا چاہتے ہیں۔

☆ عالمی کمیشن کی سفارشات کو اس طرح بذریعہ آرڈی نینس نافذ کرنے پر بھی دو طرح کا رد عمل سامنے آیا۔ تجدید پسند طبقوں نے اس کی تائید اور حمایت کی۔ ان میں بعض علماء اور وکلاء کے علاوہ ”اپوا“ اور ادارہ طلوع اسلام پیش پیش تھے۔ ”طلوع اسلام“ نے تو اسے اپنی عظیم فتح سمجھا اور اس فتح کے نشے میں ۲ مارچ ۱۹۶۱ء (آرڈیننس کے اجراء کی تاریخ) کو اسلام کی تاریخ کا نو روز تک قرار دیا اور اپریل ۱۹۶۱ء میں ادارہ نے اپنے کنونشن کو اس خوشی کے جشن کے طور پر منایا۔ اس پر صدر ایوب خان کو ہدیہ تبریک پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ چودہ سو سال کے بعد امت نے پہلی دفعہ قرآن کی طرف رجوع کیا ہے۔ نیز دعویٰ کیا گیا کہ ”عالمی قوانین کی کوئی ایک شق بھی قرآن کے خلاف نہیں ہے۔“ (باقی عالمی

قوانین تو ہمارے ”دائرہ بحث سے خارج ہیں مگر یتیم پوتے والی دفعہ نمبر ۴ کی قرآنیت پر اور اس سلسلے میں ادارہ طلوع اسلام کے کئی بار اپنے موقف کو بدلنے پر ہم آگے ذرا تفصیل سے لکھیں گے) حکومت میں شامل سیاستدانوں نے تو اس کی تعریف کرنی ہی تھی۔۔۔۔۔ ان قوانین کے نفاذ کو صدر ایوب خان مرحوم کا عظیم اسلامی اور انقلابی کارنامہ قرار دیا گیا۔ دوسری طرف آرڈی نینس کے اجراء اور اس کے نفاذ کے درمیانی مدت میں ہی علماء نے اس پر شدید تنقید کی جس میں مولانا احتشام الحق تھانوی (جو عالمی کمیشن کے نامزد رکن رہے تھے) کے اختلافی نوٹ کی صدائے بازگشت بھی سنی گئی پنجاب کے چودہ (۱۴) علماء کے ایک بورڈ نے (جس میں بریلوی، دیوبندی اہلحدیث اور شیعہ چاروں مکتب فکر کے علماء شامل تھے) متفقہ طور پر آرڈینینس کی دفعات نمبر ۴، ۵، ۶، ۷ اور ۱۲ کو خلاف شریعت قرار دیا (ان میں سے دفعہ ۴ ہی یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق تھی باقی دفعات کا ہماری بحث سے تعلق نہیں)۔ اس کے بعد سرحد کے چالیس (۴۰) علماء اور مشرقی پاکستان کے چوراسی (۸۴) علماء نے بھی ان قوانین کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ بعض تنظیموں (مثلاً جماعت اسلامی) اور ممتاز اہل علم (مثلاً مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم۔ کراچی) نے اپنی طرف سے متبادل اصلاحی تجاویز بھی حکومت کو پیش کی تھیں (جو یتیم پوتے کے مسئلہ کے ٹھیک اسلامی حل کو بھی محیط تھیں) مگر حکومت نے بعض جاہلانہ اقدامات (مثلاً پریس آرڈی نینس کا اجراء) اور اعلانات کا راستہ اختیار کیا۔

☆ مگر اس سے عالمی قوانین کے خلاف ملک کے اندر اٹھنے والی اضطرابی لہر سیاستدانوں کے لئے ”بلی کے بھاگوں چھینکا ٹونا“ والی بات ثابت ہوئی۔ انہوں نے اس مسئلہ کی گونج اسمبلیوں تک پہنچا دی۔

۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی میں عالمی قوانین کی ترمیم کے بارے میں ایک قرار داد پیش ہوئی جس کے محرک رکن صوبائی اسمبلی مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم تھے اس کے بعد اس سال پاکستان کی قومی اسمبلی کے پہلے

اجلاس میں عائلی قوانین کی ترمیم کا بل مشرقی پاکستان کے رکن اسمبلی عباس علی خان کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس پر ایک دفعہ پھر ملک طول و عرض میں اضطرابی لہر دوڑ گئی۔ تقریر اور تحریر کے علاوہ مظاہروں کا سہارا بھی لیا گیا (مثلاً ”اپوا“ کے زیر اہتمام ۴ جولائی ۱۹۶۲ء کو اسمبلی کے سامنے خواتین کا اس مجوزہ بل کیخلاف مظاہرہ) یہ بل موافقت اور مخالفت کی بھرپور بحث اور تقریروں کے بعد رائے شماری کے نتیجے میں ۴ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو نامنظور ہو گیا۔

☆ بل تو نامنظور ہوا مگر اس نے موافق مخالف جذبات میں خوب شدت پیدا کی۔ جس کے نتائج ۱۹۶۴ء میں ہونے والے عام انتخابات پر بھی اثر انداز ہوئے۔ ان انتخابات میں متحدہ حزب اختلاف نے برسراقتدار آنے کی صورت میں عائلی قوانین کی ترمیم کو بھی اپنے منشور میں شامل کر لیا۔ مسئلے کے سیاسی اثرات اور سرکاری اقدامات کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنرل ایوب خان مرحوم کو غالباً عوامی رد عمل اور اسمبلی کے اندر اور باہر عائلی قوانین کی شدید مخالفت اور رد عمل میں اپنا سیاسی مستقبل مخدوش نظر آیا تو انہوں نے اپنے سابقہ جابرانہ موقف سے کچھ پسپائی اختیار کی اور اعلان کیا کہ ”یہ قوانین نہ وحی آسمانی ہیں نہ حرف آخر۔ قومی نمائندے اگر چاہیں تو ان قوانین کو کثرت آراء سے مسنوخ کر سکتے ہیں“۔۔۔ پھر جب ۱۹۶۴ء کے عام انتخابات میں حزب اختلاف نے عائلی قوانین کی ترمیم کو اپنے منشور میں شامل کر کے اسے اپنی انتخابی مہم میں ایک کارگر حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہا۔ تو حکومت کی طرف سے بھی یہ تاثر دیا گیا کہ ”مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جائے گا جس کے ذریعے عائلی قوانین کی ان تمام دفعات کو جو اسلام سے متصادم ہیں کالعدم قرار دیا جائے گا۔۔۔“ تاہم حکومت کی یہ پسپائی وقتی اور سیاسی ہی تھی الیکشن کے بعد عائلی قوانین جوں کے توں رہے۔

☆ ۱۹۶۴ء کے بعد ان قوانین پر بحث میں وہ گرمی نہ رہی جس کی ایک

وجہ غالباً ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ بھی تھی۔ جس نے بعض نئے موضوعات کو جنم دیا۔ جن کے سامنے یہ مسئلہ دب گیا۔ تاہم ۱۹۶۸ء میں جب صدر ایوب خان کے خلاف غم و غصہ کی لہر اٹھی اور سیاستدانوں نے عوام کے جذبات کو خوب بھڑکایا۔ تو حکومت کے خلاف اس تحریک میں دوسرے عوامل کے علاوہ ”حکومت کے دامن پر عائلی قوانین کا الزام“ بھی شامل تھا۔ جس کا اظہار تحریک کے دوران مختلف جلسوں میں سیاستدانوں کی طرف سے تقاریر میں کیا گیا۔ اگرچہ خود یہ سیاستدان اس مسئلے کے بارے میں مخلص نہ تھے بلکہ وہ تو ”روٹی کپڑا اور مکان“ کے نعرے کی طرح اسے بھی صرف ایک کارڈ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ تاہم شاید یہ کہنا نرا غلط نہیں ہوگا کہ پاکستان کی سیاسی زندگی میں جنرل ایوب خان مرحوم جیسے آمر کی مضبوط حکومت کے زوال میں عائلی قوانین کا بھی دخل ضرور تھا۔

☆ صدر ایوب خان والے آئین کے مطابق یکم اگست ۱۹۶۳ء کو ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کونسل کے پہلے صدر جسٹس ابو صالح محمد اکرم تھے۔ ان کے بعد علامہ علاؤ الدین صدیقی، جسٹس حمود الرحمن، جسٹس محمد افضل چیمہ اور جسٹس تنزیل الرحمن صاحب یکے بعد دیگرے اس کے چیئرمین نامزد کئے گئے۔ ۱۹۷۳ء کے بھٹو مرحوم والے آئین کے تحت اس کونسل کا نام ”اسلامی نظریاتی کونسل“ کر دیا گیا۔ جس کے صدر ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ مقرر ہوئے تھے۔ اس کونسل (یا کونسلوں) کے اغراض و مقاصد میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ”وہ حکومت کو ان اسلامی امور سے متعلق مشورہ دے گی یا راہنمائی کرے گی جو حکومت کی طرف سے پوچھے جائیں گے۔“

☆ حکومت کی مذکورہ بالا پوائی یا سیاسی لچک کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ عائلی قوانین کے بارے میں (جن میں یتیم پوتے کی وراثت کا زیر بحث مسئلہ بھی شامل تھا) حکومت کے ایما پر کونسل نے اکتوبر ۱۹۶۳ء سے علامہ علاؤ الدین صدیقی کی

زیر صدارت غورو خوض شروع کیا جو مارچ ۱۹۶۷ء تک جاری رہا اور دسمبر ۱۹۶۷ء میں کونسل نے اپنی سفارشات حکومت کو بھجوا دیں۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۶۹ء میں (جب صدر ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہو گئی تھی) وزارت قانون کی طرف سے صدر پاکستان کے ایما پر کونسل کو دوبارہ ہدایت کی گئی کہ وہ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ (جس کا تعلق یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ سے ہے) اور دفعہ نمبر ۶ (جو مسئلہ تعدد ازدواج سے متعلق ہے) پر دوبارہ غور کر کے رائے دے۔ کونسل نے اس سلسلے میں کارروائی مکمل کر کے ”ستمبر ۱۹۶۹ء میں اپنا جواب حکومت کو بھجوا دیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان (دونوں دفعہ کی) سفارشات میں کونسل نے خاص یتیم پوتے کی وراثت والی دفعہ نمبر (۴) کے معاملے میں کیا موقف اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً دس سال (جس میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا دور بھی شامل تھا) اس مسئلے پر مکمل خاموشی رہی اور کسی مزید پیش رفت کے بغیر عائلی قوانین نافذ رہے۔

☆ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق صاحب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر ملک پر مارشل لاء کے ذریعے مسلط ہو گئے۔ انہوں نے اگرچہ ملکی آئین کو روند ڈالا اور بعد میں ترامیم کے ذریعے اسے مسخ بھی کر دیا۔ تاہم انہوں نے ایوب خاں اور یحییٰ خان کی طرح آئین مطلقاً منسوخ نہیں کیا اور بہت سے آئینی ادارے کام کرتے رہے۔ ان اداروں میں سے ایک ”اسلامی نظریاتی کونسل“ بھی تھی۔

۱۵ نومبر ۱۹۷۸ء کو جنرل ضیاء الحق نے بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ”اسلامی نظریاتی کونسل“ کو ہدایت کی کہ وہ تمام عائلی قوانین (جس میں یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ بھی شامل تھا) کا از سر نو جائزہ لیکر رپورٹ پیش کرے۔ اس حکم نامہ کے مطابق کونسل نے ۲۹ جنوری ۱۹۷۹ء سے ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء تک غورو خوض کرنے کے بعد اپنی سفارشات ۳۰ اپریل ۱۹۷۹ء کو حکومت کو پیش کر دیں۔ ہمیں

”اگرچہ اسلامی نظریاتی کونسل نے قبل ازیں مسلم عاقلی قوانین میں ترامیم تجویز کی تھیں مگر وزارت امور مذہبی اور وزارت قانون دونوں کا خیال ہے کہ اس قانون کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ کونسل کو اس اقدام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تاہم کونسل کے تین اراکین بشمول خاتون رکن اس قانون کو مکمل ختم کرنے کی تجویز سے متفق نہیں ہیں اور وہ کونسل کی تجویز کردہ ترامیم کے حق میں ہیں۔“

ہمیں معلوم نہیں کہ کونسل نے عاقلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ (جو یتیم پوتے پوتی کی وراثت سے متعلق ہے) میں بھی کوئی ترامیم تجویز کی تھی یا نہیں اور اگر کی تھی تو وہ کس نوعیت کی تھی۔۔۔ تاہم کونسل نے جب وزارت قانون اور مذہبی امور کو مذکورہ بالا فیصلے سے اتفاق کر لیا۔ تو اس کے بعد کونسل کی اپنی ترمیمی تجاویز کی ویسے بھی کچھ حیثیت باقی نہ رہی۔

☆ اس کے بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۸۱ء کو کونسل نے از خود یہ سفارش پیش کی کہ مسلم پرسنل لاء (عاقلی قوانین) کو بھی وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار (سماعت) میں شامل کر دیا جانا چاہئے کیونکہ کونسل کی سابقہ سفارشات پر بھی عملدرآمد نہیں ہو سکا (اور وزارت قانون کی سفارش یا فیصلے کو بھی نافذ یا قبول نہیں کیا گیا تھا) اگر یہ قوانین اس عدالت کے دائرہ اختیار میں دیدیے جائیں تو عدالتی فیصلوں کا نفاذ لازمی ہوگا“ کونسل کی طرف سے یہ سفارش ۲۶ ستمبر ۱۹۸۱ء کو وزارت امور مذہبی کے توسط سے صدر مملکت کو بھیجی گئی۔

اس سفارش کے بعد وزارت امور مذہبی نے کونسل کو مطلع کیا کہ ”مسلم پرسنل لاء کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سماعت میں لانے کی تجویز پر کابینہ کے اجلاس منعقدہ ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء میں غور کیا گیا۔ لیکن کابینہ نے کونسل کی اس سفارش کو منظور نہیں کیا۔“

☆ اس طرح ایک مارشل لاء کے نافذ کردہ اور دوسرے مارشل لاء کے تحفظ وادہ یہ قوانین جوں کے توں نافذ رہے اور آج تک نافذ ہیں۔ اگرچہ اس کے بعد

بھی بعض دینی حلقوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان قوانین کو منسوخ کرنے یا کم از کم ان کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں لانے کا مطالبہ کیا جاتا رہا (۲) لیکن جنرل ضیاء الحق صاحب نے پہلے جرنیلوں اور غیر جرنیل حکمرانوں کی نسبت مزید پکا کام کر دیا۔ یعنی قوانین کو آئینی تحفظ دے دیا کہ اب آئین میں ترمیم کئے بغیر ان کے بارے میں کوئی مطالبات تسلیم نہیں کئے جاسکتے۔

☆ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تعجب انگیز بلکہ ناقابل فہم سی بات یہ ہے کہ جب وزارت قانون نے ۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء کو ان قوانین کو ارتداد کی حد تک قرآن میں تحریف، خلاف کتاب و سنت اور اسلام کے روشن چہرے پر ایک سیاہ دھبہ قرار دیدیا تو سرکاری سطح پر اس فیصلے کے باوجود ان قوانین کو کالعدم کیوں نہ کر دیا گیا۔ جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل بھی اس فیصلہ پر صاف کر چکی تھی۔ ان عوامل و منکرات کا کچھ پتہ نہیں چلتا جو آخری مرحلے پر مانع ثابت ہوئے۔ حالانکہ بظاہر جنرل ضیاء الحق کے دور میں یہ کام باسانی سرانجام پاسکتا تھا یا کم از کم نظریاتی کونسل کی ترمیم ہی قبول کی جاسکتی تھیں۔ ایسا کیوں نہ ہوا؟

☆ اسلامی نظریاتی کونسل کے اس وقت کے چیئرمین جسٹس تنزیل الرحمن صاحب نے اس پر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت غالباً خواتین کے ایک طبقہ کی طرف سے مخالفت کے اندیشہ کے پیش نظر مسلم عالمی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء (جن کی دفعہ نمبر ۴ یتیم پوتے سے متعلق ہے) کے بارے میں کونسل یا وزارت قانون کی سفارشات پر عمل پیرا نہ ہو سکی۔“

پروفیسر قاری محمد طاہر صاحب کا خیال ہے کہ ”جنرل صاحب اتنے کمزور اعصاب کے آدمی نہیں تھے اور حالات پر بھی ان کی مضبوط گرفت تھی۔ ان کے اس قانون کو ختم نہ کرنے کا محرک صرف ایک ہی تھا یعنی وزارت قانون اور بعض دیگر حکومتی حلقوں کا انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویہ۔۔۔ اور یہ بات میں حکومت وقت کی ہاں میں ہاں ملانے کی مذموم روش۔۔۔ عالمی قوانین ۱۹۶۱ء میں نافذ

ہوئے۔ ان کے نفاذ کے وقت اور اس کے بعد بھی حکومتی حلقوں کی طرف سے ان قوانین کے حق میں دلائل دیئے جاتے رہے اور ان قوانین کو اسلام کے موافق اور پاکستانی قوم کے انتہائی مفاد میں قرار دیا گیا۔ سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اخبارات اور جرائد نے ان قوانین کو حکومت کا بہت بڑا اسلامی اور انقلابی کارنامہ بنا کر پیش کیا۔ بعض علماء بھی حکومت کے اس اقدام پر تحسین آمیز تقاریر کرتے رہے اور مضامین لکھتے رہے۔۔۔۔۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کی حکومت میں معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔ وہی وزارت قانون جس نے ۱۹۶۱ء میں ان قوانین کے (صدارتی حکم کے تحت اجراء کا اعلان کیا تھا۔ اسی وزارت نے ۱۹۸۰ء میں قوانین کو ارتداد کی حد تک اسلام، قرآن اور سنت کے مخالفت قرار دے دیا۔۔۔۔۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟

☆ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ یہ لوگ ”بینگن“ کی بجائے ”صاحب“ کے غلام ثابت ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں جنرل ایوب خان برسر اقتدار تھے اور وہ ان قوانین کو اسلامی سمجھتے تھے (یا ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی) اور وہ ان قوانین کو نافذ کرنا چاہتے تھے تو اقتدار کی ساری ایجنسیاں ان کے حق میں راگ الاپنے لگیں۔ ۱۹۸۰ء میں اقتدار جنرل ضیاء الحق کے پاس تھا۔ ان کی ارکان اسلام کے ساتھ محبت کے مظاہر، علماء کی قدردانی کی پالیسی اور اسلامی نفاذ کے جذبے کا اظہار ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ لہذا اب حکومتی اداروں نے بھی وہی روپ دھار لیا۔ اور ”جو تھا نا خوب بتدرتج۔۔۔۔۔ بلکہ اچانک ہی وہی خوب ہوا۔۔۔۔۔“ غالباً جرنیل صاحب اس ”نکص علی اعقاب“ یا Right about turn سے چڑ گئے۔ یا محتاط ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض علماء کی تضاد بیانی اور حسب موقع اپنا موقف بدل لینا بھی اس کا سبب بنا ہو۔ جس کی اس زمانے میں مثالیں ملتی ہیں۔

☆ تاہم جنرل ضیاء الحق کا ان قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے بھی دائرہ اختیار سے باہر رکھ کر ان کو آئینی تحفظ دلانے کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ کیا وہ بھی اپنے اوپر ”بنیاد پرستی“ کا الزام نہیں لینا چاہتے تھے؟ کیا وہ اپنی

ذات یا اپنی حکومت کے بعض ظاہری اور باطنی تضادات کے دباؤ کا شکار تھے؟
کیا ان کو اپنی ہی قائم کردہ وفاقی شرعی عدالت پر اعتماد نہیں تھا؟ اور اسی
لئے انہوں نے عائلی قوانین کے علاوہ بعض اور چیزیں (مثلاً مالی امور) بھی اس
عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر رکھے تھے۔

ان سوالوں کا جواب تو اب ”واللہ اعلم بالصواب“ ہی ہے۔ کیونکہ
نیتوں کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ البتہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی قدرتوں سے
پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح آدمی بھی بڑی حد تک اپنی عادتوں اور حرکتوں سے پہچانا
جاتا ہے۔

بہر حال یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے ہمارے موضوع سے
متعلق تو اس سارے قصے میں یہ بات ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ ۱۹۵۳ء
میں پہلی دفعہ سیاست میں لایا گیا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں وہ دوبارہ دینی اور علمی سے زیادہ
سیاسی مسئلہ بنا لیا گیا اور اسے ایک دوسرے اہم سیاسی مسئلہ (عائلی قوانین) کے
ساتھ شامل کر دیا گیا اور ۱۹۶۱ء میں قانون بن جانے کے بعد سے وہ ایک سیاسی
موضوع ہی چلا آیا ہے۔ لیکن ہم اپنی بحث میں اسے علمی اور فقہی نقطہ نظر سے ہی
دیکھتے چلے آئے ہیں اور اسی پہلو سے اس کی موجودہ قانونی حیثیت پر مبصرانہ نگاہ
ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آخر کار تو وہ دینی مسئلہ ہی ہے۔

☆ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ میں اسے جن الفاظ کے ساتھ مقید کیا گیا
ہے اس کی اصل انگریزی عبارت اور اس کا مستند قانونی اردو ترجمہ ہم ابھی اوپر
بیان کر آئے ہیں۔ اب ہم اس دفعہ پر اس نقطہ نظر سے بات کرنا ضروری سمجھتے
ہیں کہ اس دفعہ کے یہ الفاظ عبارت کہاں سے لئے گئے ہیں۔۔۔ اس کی انشاء
(Drafting) کے پیچھے کس کا ذہن کام کر رہا تھا۔۔۔ اور قرآن و سنت کی روشنی
میں قانون کے ان الفاظ کے مضمرات کیا ہیں؟

آئیے ذرا درج ذیل عبارت پر نظر ڈالئے:

مورث کا کوئی ایسا نسبی رشتہ دار جو اس کے ترکہ میں سے اس کی وفات کے بعد حصہ پاتا لیکن جو مورث کی وفات سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اسکی جگہ اس کا قریب ترین نسبی رشتہ دار لے گا اور مورث کی وفات کے وقت وہی حصہ پائے گا جو اس فوت شدہ کو ملتا۔۔۔۔۔ یہ عبارت طلوع اسلام اپریل ۱۹۵۳ء صفحہ ۵۸ سے لی گئی ہے اور یہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں محمد اقبال چیمہ ایم ایل اے کی طرف سے پنجاب اسمبلی میں پیش کردہ ترمیمی بل کے مسودہ میں (جس پر مقالہ کے ضمیمہ الف میں مفصل بات ہوئی تھی) مزید ترمیم کے لئے تجویز کی گئی تھی یعنی ”طلوع اسلام“ کے نزدیک چیمہ صاحب کا مجوزہ ترمیمی بل ان کے الفاظ اور اس عبارت کے ساتھ پیش ہونا چاہئے تھا۔ طلوع اسلام والوں کے اس بدلتے ہوئے موقف اور وراثت میں قائم مقامی کو صرف ”نسبی رشتہ داروں“ تک محدود کرنے کے صریحاً خلاف قرآن اور محض جاہلانہ تحکم ہونے پر بھی ہم نے اپنے مقالہ میں مختصراً تنقید کی تھی (دیکھئے کتاب کے دوسرے حصے میں باپ پنجم کے آخر پر صفحہ ۱۱۹، حاشیہ ۱۳) لیکن اب ذرا تفصیل کے ساتھ بات کرنا ضروری ہوتا ہے۔

☆ آپ اس عبارت کا عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کی عبارت سے آنے سامنے لکھ کر موازنہ کیجئے۔ ایک ہی مفہوم بلکہ الفاظ بھی قریباً یکساں ہیں۔ یہاں کسی ”نسبی رشتہ دار“ کا مورث سے پہلے فوت ہو جانا بیان ہوا ہے۔ جبکہ قانون کی دفعہ نمبر ۴ میں ”مورث کے کسی بیٹے یا بیٹی کی موت“ کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اس عبارت میں وراثت کے آگے ”مورث کے قریب ترین نسبی رشتہ دار“ کو منتقل ہونے کی بات کی گئی ہے جبکہ دفعہ نمبر ۴ ”بیٹا بیٹی“ اور آگے ”ان کی اولاد“ کے لفظ لائے گئے ہیں اس لئے کہ ”نسبی رشتہ دار“ میں بھی ایک ابہام تھا اس میں تو پھر ”ماں اور باپ“ بھی آتے تھے اور یہ پھر وہی ناممکن العمل قائم مقامی کی ایک صورت ہوتی اس لئے وزات قانون کے باہر ڈرافٹ نویسوں نے ”بیٹا بیٹی“ اور ”اولاد“ کے الفاظ ڈال کر بات صاف کر دی۔ باقی مضمون یکساں ہے۔ گویا دفعہ

نمبر ۴ کی عبارت دراصل متجددین کے علمبردار ادارہ طلوع اسلام ہی کی تجویز کردہ ہے۔۔۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دفعہ نمبر ۴ کی اصل انگریزی نص (قانونی عبارت) میں ”مورث“ کے لئے لفظ ”Propositus“ استعمال ہوا ہے جس کے قانونی معنی صرف ”نسبی مورث“ کے ہیں۔ ڈکشنری میں قانونی اصطلاح کے طور پر اس کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں۔

"The person from whom a line of descent is derived on a genealogical table."

قرآنی قانون وراثت کے مطابق تو ”وارث“ کی طرح ”مورث“ بھی چھ افراد یا رشتہ دار ہو سکے ہیں یعنی ”ماں‘ باپ‘ خاوند‘ بیوی‘ بیٹا اور بیٹی“ یہ سب وراثت لیتے بھی ہیں اور ان سب سے وراثت ملتی بھی ہے۔ یہ قرآن کی رو سے بنیادی وارث اور مورث ہیں ان کا تعلق باہم متبادل (Reciprocal) یا Counterpart) کا سا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے تو اسے وارث بننے سے اور اگر ”متوفی“ ہے تو اسے مورث (وراثت دینے والا) بننے سے قانوناً روکا نہیں جاسکتا۔ مورث کے ان شرعی معنی سے بچنے کے لئے لفظ Propositus لایا گیا اور پھر مزید تاکید کے لئے وارثوں میں صرف بیٹا یا بیٹی کا ذکر کر دیا گیا۔ گویا وہی ”نسبی رشتہ دار“ کو ہی مورث اور اسی کو وارث بنایا گیا ہے۔ صرف لفظ دوسرے ہیں اور ساتھ تاکیداً ”Per stirpes“ کے لفظ لائے گئے ہیں جس کے معنی ہیں ”for each line of descent“ یا زیادہ قانونی مفہوم کے مطابق for each one from which a family is descended گویا ہر طرف سے ”نسب“ پر ہی زور ہے۔

☆ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کی عبارت کی اصل وہی طلوع اسلام والی مجوزہ عبارت ہے۔ اور اسی لئے تو طلوع اسلام نے اپنے اپریل ۱۹۶۱ء والے کنونشن کو۔ عائلی قوانین کے نفاذ پر جشنِ فتح کے طور پر منایا تھا۔ ادارہ

کے اس وقت کے سربراہ غلام احمد پرویز صاحب کے کنونشن سے خطاب کے حسب ذیل الفاظ قابل غور ہیں: ”براداران گرامی! کس قدر جواں بخت ہے یہ ہمارا دور جس میں چودہ سو سال کے بعد رجعت الی القرآن کی صدائے جمیل نے فضاء میں حسین ارتعاش پیدا کیا۔ کس قدر خوش نصیب ہے یہ خطہ پاک جسے ان آسمانی قوانین کا گہوارہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی اور کس قدر مستحق تبریک و تہنیت ہے وہ ثریا بخت مملکت جس نے دنیا میں پھر سے قرآن کی آواز بلند کی ہے۔ الخ“ (دیکھئے طلوع اسلام مئی جون ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۴) پرویز صاحب کی یہ تحریر (جسے آپ قلبہ گوئی کہیں یا پر شکوہ اسلوب) بہر حال ایک تو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ پرویز صاحب کا اہل علم ہونا متنازعہ فیہ ہو سکتا ہے ان کے اہل قلم ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے یہ عبارت ان کی اس بے پایاں مسرت پر دال ہے جو ان کو عائلی قوانین (اور خصوصاً اس کی دفعہ ۴) کے حسب مرضی نفاذ سے ہوئی تھی۔

☆ اب یہاں اس نقطہ پر توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے کہ کیا طلوع اسلام (یا اسکے بانی مہانی پرویز صاحب) ”یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ“ پر شروع سے یہی رائے رکھتے تھے جو انہوں نے اقبال چیمہ صاحب کے ”مجوزہ“ ترمیمی بل کے مسودہ کی اصلاح کیلئے پیش کی تھی اور جسے عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ میں قانونی شکل دیئے جانے پر ان کے اندر خوشی سے لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ اس کے لئے ہمیں ایک دفعہ پھر اس قضیے پر ۱۹۱۷ء سے اب تک کے بعد مراحل کو خاص اس پہلو سے یعنی اپنے موقف پر ثابت قدم رہنے یا نہ رہنے کے نقطہ نظر سے دیکھنا پڑے گا۔ کیونکہ ویسے تو ہم اس داستان کا کچھ حصہ اصل مقالہ میں اور باقی اس ضمیمہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

☆ ہم مقالہ کے پہلے حصے میں مسئلہ کے ”قدیم پہلو“ کے ضمن میں فقہائے متقدمین (سنی شیعہ ہر دو) کا حیرت انگیز حد تک متفقہ اور مجمع علیہ موقف بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں (مقالہ کے حصہ دوم میں) کہ اس موقف کی

بنیادی وجہ ”قرآنی قانون وراثت میں نظریہ نیابت (قائم مقامی) کا ناممکن العمل ہونا“ ہے۔ ہمارے علماء اس مسئلہ پر سلف سے خلف تک کامل اتفاق کی بات تو کرتے تھے مگر اس ”اتفاق“ اور اجماع کی بنیادی وجہ بیان کرنے سے قاصر رہے یا یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی۔ بہر حال جب یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ متنازعہ فیہ بنا دیا گیا (جس کی ابتداء ۱۹۱۷ء سے ہوئی اور جس میں روز ۱۹۳۸ء کے بعد سے آگیا تھا) تو بعض اہل علم کے ذہن میں یہ بات (متفقہ موقف کی بنیاد ڈالی) آئی جس کا تقریر اور تحریر میں بھی ذکر ہوا اور جس سے استفادہ کرتے ہوئے ہم مقالہ کے حصہ دوم (باب پنجم) میں بالتفصیل بحث کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کے موقف کی بنیاد مستحکم تھی۔ اسی لئے ان کو اس میں کسی ترمیم یا تبدیلی کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔۔۔ اگر قرآن کا قانون وراثت برحق ہے تو اس کے نفاذ کے نتیجے میں یہ (محبوب الارث والا) بھی برحق اور اہل ہے۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ متجددین کا موقف اس بارے میں بدلتا رہا ہے۔ بلکہ فلا بازیاں کھاتے رہے ہیں۔ اس بارے میں ان کا سارا سرمایہ ”انا اسلم جیرا جپوری صاحب کا مقالہ ”محبوب الارث“ تھا جو خود خواجہ احمد الدین امرتسری مرحوم کے مجموعہ رسائل ”الوراثۃ فی القرآن“ سے ماخوذ تھا۔ جیرا جپوری نے یتیم پوتے کے مسئلہ کے حل کے لئے اپنے مقالہ میں اقربیت کا نیا مفہوم پیش کیا تھا (جو ہمارے مقالہ میں زیر بحث آچکا ہے) ان کے اس نظریہ اقربیت میں اور اس کی تعبیر و توضیح میں (جس طرح اسے طلوع اسلام نے پیش کیا) دو باتیں بڑے واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آئیں۔

(۱) ”یتیم پوتا (یعنی بھتیجا) اپنے چچا کا بھائی بن کر اپنے باپ کا حصہ بطور وراثت لے سکتا ہے۔“ (دیکھئے مقالہ کا حصہ دوم باب دوم کی فصل اول بحوالہ تین اہم مسائل صفحہ ۱۸۵)

(۲) ”مردوں کے حصے (وراثت میں) نہیں نکالے جاتے۔ یتیم پوتے (بھتیجے)

کو براہ راست اپنا حصہ ملتا ہے (بھائی بن کر) نہ کہ اس کے متوفی باپ کا حصہ“
(دیکھئے مقالہ کا مندرجہ بالا (حصہ دوم کے باب دوم والا) حصہ بحوالہ تین اہم سال
صفحہ ۱۵۷-۱۵۶۔

لیکن جو نہیں صرف ایک چچا اور ایک بھتیجا (یتیم پوتا) کی بجائے جیراچپوری
صاحب کے اس قاعدہ اقربت کے مطابق ایک چچا یا زیادہ چچاؤں کے ساتھ متعدد
بھتیجیوں اور بھتیجیوں کا تصور سامنے آیا (جو کوئی نادر الوقوع چیز بھی نہیں) تو اس
”اجتہاد نو“ کی غلطی بلکہ لغویت اور نامعقولیت واضح ہو گئی (۳) (دیکھئے اصل مقالہ
کے حصہ دوم کے باب دوم کی فصل اول کا آخری حصہ) چنانچہ مجددین کے اس
وقت کے قائد و سربراہ جناب پرویز صاحب بھی اسے سمجھ گئے تھے۔ (اگرچہ جان
لینے کے باوجود ظاہر امان لینے سے گریز کیا)۔ اسی لئے انہوں نے چوہدری محمد اقبال
چیمہ والے مجوزہ ترمیمی بل کی تعریف کے پل باندھنے کے باوجود چیمہ صاحب کے
مسودہ میں (جس پر ہم نے مقالہ کے ضمیمہ الف میں بات کی ہے) وہ ترمیم پیش کی
جو ہم نے ابھی اوپر طلوع اسلام اپریل ۵۴ء کے حوالے سے بیان کر دی اور جو بعد
میں عاقلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کی بنیاد بنی۔ حالانکہ مولانا اسلم جیراچپوری صاحب
کے جس نظریہ اقربت کے تختے پر کھڑے ہو کر قائد مجدد اپنا قد (Image) بلند
کر رہے تھے اس کے مطابق تو یہ ترمیم یوں پیش کرنی چاہیے تھی۔۔۔ کہ
”مورث کا کوئی ایسا پوتا پوتے یا پوتی پوتیاں جس کا باپ / جنکے باپ مورث کی زندگی
میں فوت ہو گئے ہوں تو ان کو اپنے چچا / چچاؤں کا بھائی بہن سمجھ کر مورث کی
وراثت تقسیم کی جائے گی۔“ اگر عاقلی قوانین میں بھی اس طرح کی قانون سازی
ہو جاتی تو پھر پتہ چلتا کہ وکلاء اور عدالتوں کے جج کس طرح سر پکڑ کر بیٹھے نظر
آتے۔

خیال رہے کہ جیراچپوری صاحب کے اعتراضات چونکہ حنفی فقہ فرائض
پر ہی تھے اس لئے انہوں نے یتیم نواسے یا نواسی (یعنی ماں کی طرف سے یتیم)

کو ماموں کے ساتھ بھائی بہن بنا کر حصہ دینے کی بات نہیں کی تھی (جو عملاً تو شیعہ فقہ فرائض کا مسئلہ ہے اگرچہ حنفی فقہ میں بھی ان کا درجہ بعد میں بطور اولوالارحام آتا ہے)۔۔۔۔۔ ورنہ اگر اس مجوزہ ترمیم میں یتیم بھتیجیوں، بھتیجیوں کو بھائی بہن بنانے کے ساتھ مرنے والی بہن کی اولاد کو بھی زندہ رہ جانے والے ماموں کے ساتھ بھائی بہن بنا دیا جاتا جو اس نئے نظریہ اقرابت کا لازمی نتیجہ بنتا ہے۔ تو کیا ہوتا اس کی دو مثالیں ہم مقالے کے دوسرے حصے کے باب دوم کے آخر میں بیان کر آئے ہیں۔۔۔۔۔ پنجاب مقننہ کی طبع کردہ آراء میں اس نامعقول نظریہ کی کچھ مزید مثالیں بھی دی گئی تھیں جن کے حوالے ہمارے مقالے کے حصہ دوم کے باب دوم کی فصل دوم میں بھی دیئے گئے ہیں۔

☆ بہر حال اپنے اس مایہ ناز نظریہ اقرابت میں پوشیدہ مغالطہ کی حقیقت اور نامعقولیت ظاہر ہو جانے پر متجددین (یا طلوع اسلام) کو اپنا یہ نظریہ ترمیمی بل میں پیش کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ یہ پہلی قلابازی تھی کہ اپنا بہت تشہیر دادہ موقف بدل لیا۔

یہاں برسمیل تذکرہ یہ بات بھی قابل ذکر بلکہ باعث تعجب ہے کہ جب عالمی قوانین بن گئے اور اس کی دفعہ نمبر ۴۱۱ قانون خود طلوع اسلام ہی کی مذکورہ بالا مجوزہ ترمیم کے مطابق ہی تھا اور اسی قانون کی متجددین حضرات مدح سرائی بھی کر چکے تھے۔ لیکن جب مارچ ۱۹۸۶ء میں بعض علماء نے عالمی قوانین کے خلاف قرآن و اسلام ہونے کے مسئلہ کو دوبارہ چھیڑ دیا۔ تو ادارہ طلوع اسلام نے اپنے اپریل ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں ان علماء پر سو قیامہ طعن و تشنیع کی (اگر پرویز صاحب مرحوم زندہ ہوتے تو غالباً وہ اپنی تحریر کا وقار یوں نہ گنواتے)۔ اس شمارے میں صورت مسئلہ سمجھانے کے لئے پھر وہی مولانا جیراجپوری صاحب کے مقالہ ”محبوب الارث“ والی مثالیں اور وہی نیا نظریہ اقرابت (پچھلی فائلوں سے نکال کر) دوبارہ نقل کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ لوگ ایوب خانی قانون کو تسلیم کر کے خود ہی اپنی اس

”ہلدی کی گرہ“ کو نامعقول سمجھ کر پرے پھینک چکے تھے۔ پھر اس متروک اور نامعقول بحث کو دوبارہ درمیان میں لانے کا کیا فائدہ؟

☆ دوسری طرف پنجاب مقننہ کی طبع کردہ پبلک آراء کے سامنے آنے پر طلوع اسلام والوں کو نظریہ قائم مقامی کے قرآنی قانون وراثت میں ناقابل عمل ہونے کی بھی سمجھ آگئی (اس نظریہ قائم مقامی پر بھی مقالہ کے دوسرے حصے میں۔ باب دوم کی فصل دوم میں مفصل بحث ہو چکی ہے) تو وہ اپنے علی الاعلان بیان کردہ موقف ”کہ سن رکھئے مردوں کے حصے نہیں نکالے جایا کرتے۔“ (دیکھئے مقالہ کے حصہ دوم کی فصل اول بحوالہ تین اہم مسائل ۵۷-۶۵۶) سے بھی منحرف ہو گئے۔ یہ دوسری قلابازی تھی کہ ”فوت شدہ کا حصہ“ (جو اس فوت شدہ کو ملتا) نکالنے پر بھی آمادہ ہو گئے۔

☆ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ کہ قرآن کریم کے بنیادی چھ وارثوں (ماں باپ بیوی خاوند بیٹی بیٹا) میں سے حق وراثت میاں بیوی سے بلکہ عملاً والدین سے بھی چھین لینے پر آمادہ ہو گئے اور حق وراثت کو صرف نسبی رشتہ داروں (بیٹا بیٹی) تک محدود کر دیا (کیونکہ قائم مقامی صرف اسی صورت میں چل سکتی ہے) یہ قرآن حکیم کے قانون وراثت بلکہ اصول وراثت ہی سے صریح بغاوت ہے۔ ہم نے مقالے میں بھی اس خودرایانہ اور جاہلانہ تحکم پر تنقید کی تھی (دیکھئے مقالہ کے دوسرے حصے کے باب پنجم کا آخری حصہ)۔ قرآن کریم میں تو ہے کہ ”مما ترک الوالدان والاقربون“ (النساء/۷) کہ وراثت ماں باپ سے بھی ملے گی اور بعض دوسرے قریبی (الاقربون) رشتہ داروں (مثلاً بیوی خاوند بیٹا بیٹی) سے بھی۔۔۔ طلوع اسلام کی نسبی رشتہ داروں والی تجویز (اور پھر اسی پر مبنی عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴) کے مطابق تو وراثت دینے کا حق صرف والدین کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے۔ ”الاقربون“ (جن میں خاوند اور بیوی لازماً شامل ہیں) سے وراثت پانے کے قرآنی حق کا ہی انکار کر دیا گیا ہے۔ ”قرآنی فکر“ کی یہ کون

سی قسم ہے؟ کاش کہ اپنے مخالف علماء کو ”منکرین قرآن“ کہنے والے (دیکھنے متفہم) پنجاب کی پبلک آراء میں طلوع اسلام کے پیش کردہ مضمون میں صفحہ ۵ پر عنوان ”منکرین قرآن کی طرف سے جواب“ اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیتے۔ اتنی سی بات کو تو آیات میراث کا ترجمہ جانے والا بھی سمجھ سکتا ہے اس کے لئے مفکر قرآن ہونا بھی ضروری نہیں۔

☆ میاں بیوی کا وراثت میں حصہ تو قرآن کریم کا اتنا واضح حکم ہے کہ اس کو ترک کرنے کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ اسی لئے اہل سنت زوجین کو ذی الفروض میں رکھ کر سب سے پہلے ان کا حصہ نکالتے ہیں اور اسی لئے فقہ جعفری میں زوجین کو طبقات وراثت سے الگ رکھا گیا ہے کہ زوجین ہر طبقہ کے ساتھ وراثت پائیں گے وہ کبھی محبوب نہیں ہو سکتے۔

☆ وراثت کو نسبتی رشتہ داروں تک محدود کرنا اور مرنے والے کی بیوہ کو بھی اس سے محروم کرنا تو ایک لحاظ سے ہندو رواجی قانون وراثت سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ہندو قانون کے مطابق بھی بیوہ (خاوند کی اولاد نرینہ نہ ہوتے ہی صورت میں) ”تاحیات“ اپنے مرنے والے خاوند کی جائیداد کی مالک متصور ہوتی ہے البتہ وہ اسے کہیں منتقل نہیں کر سکتی۔ باقی تصرفات (ٹھیکہ، کرایہ، مزارعت وغیرہ) کا اسے حق ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہی جائیداد اس کے مرنے والے خاوند کے ”نسبی رشتہ داروں“ کی طرف لوٹ آتی ہے ہندوؤں میں چونکہ بیوہ دوبارہ شادی نہیں کر سکتی اس لئے ان کے ہاں بیوہ کا یہ حق ”تاحیات“ کے ساتھ مقید ہے۔ مسلمانوں کے جن علاقوں میں انگریزوں نے رواجی ہندوانہ قانون اپنانے کی اجازت دے دی تھی (یا جہاں خود مسلمانوں نے شریعت کے مقابلے پر رواجی (ہندو) قانون کو ترجیح دیکر اختیار کیا تھا) وہاں بھی مسلمان بیوہ (خاوند کی اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں) تا ”نکاح ثانی“ اپنے مرحوم خاوند کی جائیداد کی مالک اور بیع و انتقال کے سوا تمام تصرفات کی حقدار سمجھی جاتی تھی۔ خیال رہے کہ قرآن

ریم کے مطابق تو بے اولاد بیوہ بھی اپنے خاوند سے وراثت کی لازماً حقدار ہے۔

☆ امریکہ میں (بہت سے یورپی ممالک کی طرح) الگ قانون وراثت نہیں ہے بلکہ یہ مورث کی وصیت پر منحصر ہے۔ وہاں اگر کوئی آدمی بغیر وصیت کئے مر جائے تو حکومت ہی اس کی ساری جائیداد کی وارث ہوتی ہے۔ البتہ حکومت کے قبضہ کر لینے کے بعد مرنے والے کی صرف بیوہ (جس کے حق میں وصیت بھی نہیں ہو سکی تھی) اپنا کچھ حصہ حکومت سے طلب کر سکتی ہے اور اسے کچھ نہ کچھ مل بھی جاتا ہے مگر مرنے والے کا دوسرا کوئی عزیز (اولاد بھی) وصیت کے بغیر حکومت سے کچھ نہیں لے سکتا۔

ہمارا یہ دو مثالیں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی کا تعلق جس مودت اور رحمت پر مبنی ہے اسے ہندو رواج اور امریکی قانون تک نے تسلیم کیا ہے۔۔۔ مگر محض بات کی تچ کی خاطر اور ایک Issue پر شکست سے بچنے کے لئے یہ ”مفکرین قرآن“ اپنی ”فکر قرآنی“ کی ناک پر بھی ضد اور جہالت کا استرا چلا دینے سے نہیں جھجکے۔

☆ دنیا کا کوئی غیر مسلم (یہودی عیسائی وغیرہ) عربی دان بھی قرآن کریم کا مطالعہ کرے تو وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ ”یہ کتاب بیک وقت والدین زوجین اور اولاد (بیٹا بیٹی) کو لازماً وارث بناتی ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی (بوقت تقسیم وراثت زندہ ہوتے ہوئے) کسی طرح محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی نظیر ادیان عالم اور انسانی (وضعی) قوانین میں کہیں نہیں ملتی اور اس لئے Von Kremer نے اسلامی قانونی وراثت کو اسلامی قوانین کی Supremely Original Branch قرار دیا تھا (دیکھئے مقالہ کی ”تمہید“)

اور حالت یہ ہے کہ خود ”مفکرین قرآن“ اس عظیم و بے مثل قانون کی اسی ”Originality“ کو ختم کر کے اسے ہندوانہ رواجی قانون کی سطح پر لے آنے پر آمادہ ہو گئے (صرف اس فرق کے ساتھ کہ نسبی رشتہ داروں میں بیٹا بیٹی دونوں

کو (قرآن کے مطابق) شامل کر لیا جائے جبکہ ہندو قانون میں صرف بیٹا وراثت پاتا بیٹی نہیں) کیا قرآنی قانون وراثت بس اتنا ہی ہے کہ بیٹے کے ساتھ بیٹی بھی حصہ لے گی۔ آگے والدین اور زوجین کا ذکر ہی نہیں ہے؟ یا للعجب!

☆ اور پھر قرآن کریم کے اس قانون وراثت میں --- جس میں وراثت پانچ طرف سے کسی کے پاس آسکتی ہے اور پھر صاحب جائیداد کے مرتے ہی پانچ مختلف سمتوں میں روانہ ہو جاتی ہے --- اس قانون میں گردش زر کا جو اصول ہے اور انسانی معاشرے کے جو معاشی مصالح اس سے وابستہ ہیں اسے یہ ”نظام ربوبیت“ کا نعرہ لگانے والے بھی نہ سمجھ سکے یا محض ”بغیاً بینہم“ کے ماتحت ہر چیز سے آنکھیں بند کر لیں؟ جب دیکھا کہ قرآنی قانون وراثت میں تو اصول قائم مقامی کسی طرح چل ہی نہیں سکتا تو ہندوؤں کی طرح (یا دوسرے مذاہب کی طرح) صرف نسبی رشتہ داروں“ (یعنی صرف اولاد) کے حق وراثت کے نمائندہ بن بیٹھے۔ کیونکہ صرف اسی میں قائم مقامی چل سکتی ہے۔

کیا یہ اسی طرح کی سنگدلی نہیں جس کے ماتحت ہمارے جاہل مسلمانوں کو بوڑھی سوتیلی ماں کو یا جوان بے اولاد بیوہ بھاوج کو (جسے نکاح ثانی کا حق بھی دیا گیا ہے) قرآنی قانون کے مطابق وراثت میں حصہ دینا خلاف عقل اور باعث فساد نظر آتا ہے۔

☆ آئیے اب عائلی قوانین کی دفعہ (نمبر ۴) پر بھی قرآن ہی کی روشنی میں غور کر لیں۔ اس دفعہ کی انگریزی اور اردو عبارت اوپر بیان ہو چکی ہیں ذرا ان کو سامنے رکھ لیجئے۔

(۱) اس میں بھی پہلی خلاف قرآن بات تو یہی ہے کہ قرآن کریم کے مقرر کردہ چھ بنیادی وارثوں (والدین، زوجین اور بیٹا بیٹی) میں سے صرف دو (یعنی مرنے والے بیٹے یا بیٹی) کے لئے حق جائینی (یا قائم مقامی) تسلیم کیا گیا ہے۔ آخر مرنے والے خاوند، مرنے والی بیوی یا مرنے والے ماں اور باپ کا حصہ کیوں نہ نکالا جائے

اور پھر آگے ان کے ممکنہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے؟ اس پر ہم مقالے کے حصہ دوم کے باب دوم کی فصل دوم (صفحہ ۱۰ تا ۱۱) میں مفصل بات کر چکے ہیں۔ اسی سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے قانون وراثت میں نیابت یا قائم مقامی نہیں چل سکتی۔

(۲) پھر اس میں دوسری خلاف قرآنی بات یہ ہے کہ مرنے والے بیٹے یا بیٹی (بیٹوں بیٹیوں) کا حصہ نکال کر آگے ان کے قرآنی شرعی وارثوں کی بجائے صرف ان کے بیٹوں بیٹیوں ہی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر مرنے والی بیوی کے خاوند یا مرنے والے خاوند کی بیوہ کو آپ قرآن کے کس حکم کے تحت وراثت سے محروم کر سکتے ہیں؟ افلاتعقلون؟

○ یہاں ایک اور بات ضمناً سامنے آتی ہے عائلی قوانین کی اس دفعہ نمبر ۴ میں اگرچہ صریحاً یہ نہیں کیا گیا کہ مرنے والے / والی کی بیوہ / خاوند کو محروم الارث کر دیا جائے۔ تاہم قانون سازی میں اولاد (بیٹا یا بیٹی) کے الفاظ کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ جب اعلیٰ عدالتوں میں اس قانون کی عملی تعبیر و تشریح کا وقت آیا تو یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ ”مورث کی وفات سے قبل فوت ہو جانے والے پسران اور دختران کی اولاد کو اپنے باپ یا ماں کا حصہ حصہ رسدی ملتا ہے۔ ایسے فوت شدہ پسران یا دختران کی بیوہ یا شوہر کو اس حصے سے کچھ نہیں ملے گا (۴)“

غالباً کسی مرنے والے کی بیوہ نے (یا مرنے والی کے شوہر) نے اس بناء پر اپنا شرعی حق مانگا ہو گا کہ آخر جس کا حصہ تقسیم کے لئے نکالا جا رہا ہے اسی میں اس کا بھی حصہ بنتا ہے مگر عدالت مجبور تھی کہ قانون کے الفاظ (Litra legis) ان کے حق کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ یہ صرف ان کے نسبی وارثوں یعنی اولاد تک ہی محدود ہیں۔ عدالتوں کے ان فیصلوں میں ان لوگوں کے لئے بھی جواب موجود ہے جو یتیم پوتے کے محبوب الارث ہونے پر قرآن کے کسی صریح حکم (نص) کا مطالبہ کرتے ہیں بعض قانونی احکام کے لئے نص صریح نہیں ہوتی

مگر وہ نص صریح پر عمل کرنے یا اس کو نافذ کرنے کا صریح اقتضاء (Corollary) ہوتے ہیں۔

☆ قرآن حکیم کے احکام وراثت کی ان دو بغاوت کی حدوں کو چھونے والی خلاف ورزیوں کے باوجود مستجدین کا ان عائلی قوانین کی مدح سرائی کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ”اس قانون کی ایک شق بھی قرآن کے خلاف نہیں ہے“ (دیکھئے طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۸۰) اس کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟

کیا یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح نافرمانی اور اللہ کی حدود سے تجاوز اور سرکشی نہیں جس پر سورۃ النساء کی آیات میراث کے معا بعد سنت، عید سنائی گئی ہے۔ (دیکھئے سورہ النساء / ۱۴)

☆ اور آخر پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عائلی قوانین کی دفعہ نمبر ۴ کے ذریعے کی گئی اس قانون نازی نے ملک کے کتنے یتیمی کا مسئلہ (یہ مسائل) حل کر دیئے ہیں۔ اس طرح دادا کی وراثت سے حصہ لینے والے یتیم و شاید پورے ملک میں ایک سو فی لاکھ بھی مشکل ہوں گے۔

کیا باقی یتیمی کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے (مناسب ہو گا کہ ہمارے مقالہ کے حصہ دوم کے باب دوم ”قرآن اور تحفظ مصالح یتیمی“ پر ایک نظر ڈال لیں) کاش کہ پاکستان میں حکومتی سطح پر ملک بھر کے یتیمی کے مسائل کے لئے قرآنی احکام کے مطابق قانون وصیت اور قانون نفقات (کفالت) کے نفاذ کے ذریعے قانون سازی کی جاتی۔ جس میں ہر طرح کے یتیموں کے علاوہ دوسرے محتاج مگر غیر وارث رشتہ داروں (بیوہ بہنوں مفلس بھائیوں وغیرہ) اور غیر رشتہ داروں کے مسائل کے حل کی بھی گنجائش موجود ہے۔

☆ اور حکومتی سطح پر اس مسئلہ کا حل بذریعہ قانون سازی کرنے کے حوالے سے یہاں بطور تقابل یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ یہی مسئلہ (محبوب الارث یتیم پوتے وغیرہ کا) حل کرنے کے لئے حکومت مصر نے بھی قانون سازی

کی ہے اور حکومت پاکستان نے بھی۔

حکومت مصر نے اس کا علاج ”وصیة واجبة“ کا قانون نافذ کر کے یہ (جس پر مقالہ کے حصہ دوم کے باپ چہارم میں بات ہوئی تھی) چونکہ وہاں عام قانون وصیت بھی نافذ ہے اور دادا اپنی زندگی میں ایسے یتیم پوتوں نواسوں وغیرہ کے لئے وصیت کر سکتا ہے جو بعد میں قانوناً نافذ ہوگی۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی میں بطور ہبہ بھی دے سکتا ہے۔ اس لئے مصری قانون (وصیت واجبہ) ”صرف ایسے محبوب الارث پوتوں نواسوں وغیرہ (اولاد الاولاد) کے لئے ہے جن کو دادا نانا نے اپنی زندگی میں نہ تو کوئی چیز بطور ہبہ دی ہو اور وصیت بھی نہ کر سکا ہو جس کی وجہ سے یہ عام قانون وصیت سے متمتع نہ ہو سکتے ہوں (جیسے امریکی قانون میں وہ بیوی جس کیلئے خاوند کو وصیت کا موقع نہ ملا) ایسے پوتوں پوتیوں نواسوں نواسیوں کے لئے مورث کے کل ترکہ کے $\frac{1}{3}$ حصہ میں سے (جو سنت کے مطابق وصیت کی حد ہے) بذریعہ سول عدالت بطور وصیت واجبہ حصہ ملنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مصری حکومت کا یہ قانون قرآن و سنت سے قریب تر ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں الازھر (یونیورسٹی) اور علماء دین کے اثرات غالب ہیں ورنہ متجددین مبصر میں بھی تھوڑے اور کچھ کم فعال نہیں۔ وہاں تو ایسے لوگ بھی تھے جو کمال پاشا کی طرح عربی زبان کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے زبردست حامی تھے۔ لیکن وہاں کے متجددین (بلکہ نواندہ عوام) بھی عربی زبان سے اتنے جاہل نہ تھے کہ وہ قرآن کی آیات میراث میں بیان کردہ چھ بنیادی وارثوں کے مفہوم سے بھی بے خبر ہوں۔ ان کے لئے قرآنی قانون وراثت میں صرف نسبی وارثوں کا تصور سراسر اجنبی تھا۔ جو سراسر غیر اسلامی تصور ہے۔

☆ اس کے برعکس پاکستان میں چونکہ محبوب الارث کی وصیت سے متمتع ہونے کا بذریعہ قانون موقع ہی نہیں دیا گیا (یعنی یہاں قرآنی قانون وصیت نافذ نہیں) اس لئے یہاں اس مقصد (محبوب الارث کو کچھ دلانے) کے لئے قرآن کے

قانون وراثت میں ہی تحریف کر دی گئی۔ یہاں ایسے تمام اولاد الاولاد کو جو بوقت تقسیم وراثت زندہ موجود ہوں (چاہے دادا نانا ان کی اپنی زندگی میں بھی کچھ دے گیا ہو) سب کے لئے ”وراثت“ پاسکنے کے لئے قانون سازی کی گئی ہے۔ (مصری قانون میں یہ شرط مذکور ہے جبکہ ہمارا قانون بالکل خاموش ہے) اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پاکستان میں عربی بلکہ قرآن کے ترجمہ تک سے نا آشنا عوام اور ان عوام کے جذبات کا استحصال کرنے والے متجددین۔ دیگر عوامل کے علاوہ۔۔۔۔۔ سب ہی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندوانہ رواجی قانون وراثت سے متاثر اور مانوس تھے (کہ یہ قانون یہاں قریباً سو سال تک رائج رہا) اور یہ نظریہ قائم مقامی کے لئے بھی بہت موزوں ہے لہذا یہاں حکومت کی قانون سازی اس دائرے سے باہر نہ نکل سکی۔ چنانچہ یہاں کے متجددین نے (جو مصری متجددین کے مقابلے پر علم دین میں بھی فروتر ہیں) کچھ تو علمائے دین کے مقابلے پر مخالفانہ ضد کی وجہ سے اور کچھ قرآنی وراثت سے بے خبری کی بناء پر۔۔۔۔۔ ”اس مسئلے کے ایسے حل۔ (قانون) پر صاد کر دیا جو ہندوانہ رواجی قانون سے متاثر اور مانوس عوام کو پسند اور مطلوب تھا اور عوام کی اس ”پسند“ اور ”طلب“ پر گواہ ہیں پنجاب متفقہ کی طبع کردہ مجموعہ ”آراء“ میں وہ متعدد عوامی آراء جن کے طرف ہم مقالہ میں کئی جگہ حوالے دے آئے ہیں۔

☆ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں حکومت مصر کا قانونی حل نہ بتاتا قرآن و سنت سے قریب تر اور اسلامی ہے۔ جب کہ حکومت پاکستان کا حل۔ (قانون) قرآن سے بیگانہ ہندو رواجی قانون سے قریب تر اور منہس ”عوامی“ ہے۔

حواشی اور حوالہ جات

(۱) اس قسم کے مغالطہ کی نہایت عمدہ مثال عبدالعزیز الکنانی کا عباسی خلیفہ المامون کے دربار میں معتزلی وزیر کیساتھ وہ مناظرہ ہے جس کا قصہ خود انہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں لکھا ہے اس کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ”تاریخ عہد عباسیہ کا ایک ورق“ کے عنوان سے کیا تھا یہ مضمون مولانا آزاد کے ایک مجموعہ مضامین بعنوان ”صدائے رفعت“ کے صفحہ ۱۴ تا صفحہ ۸۷ پر ہے۔ یہ کتاب ملک پبلشرز۔ لائل پور (حال فیصل آباد) نے شائع کی تھی۔

(۲) مثلاً دیکھئے روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت ۲۸ فروری ۱۹۸۶ء (جمعہ میگزین) میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا مضمون اور طلوع اسلام اپریل ۱۹۸۶ء میں اس پر غیظ و غضب کا اظہار اور اپنے پرانے خود ترک کردہ موقف کی تکرار۔

(۳) اگرچہ بعد میں جب پنجاب مقننہ کی اس مسئلہ پر پبلک آراء (فروری ۱۹۵۴ء میں) شائع ہوئیں تو پتہ چلا کہ متعدد وکلاء اور ججوں نے بھی اس نظریہ کی نامعقولیت واضح کر دی ہے۔ لیکن یہاں مقالہ نگار بطور اظہار ممنونیت اس بات کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہے کہ تیاری برائے مقالہ کے ابتدائی دنوں میں جب میں نے جیراچوری صاحب کا مقالہ ”محبوب الارث“ پڑھا تو میں اس کے استدلال سے بڑا متاثر ہوا اور انکے اس نئے نظریہ اقربت اور یتیم بھتیجے کو چچا کا بھائی بنا کر وراثت دینے کو نہایت معقول حل سمجھنے لگا تھا۔ ۱۹۵۳ء کی تعطیلات گرما میں اپنے گاؤں (حبیب ضلع جھنگ) گیا تو وہاں مولانا محمد حسن خطیب جامع مسجد جھنگ شہر سے اس مسئلہ پر تبادلہ خیالات کے لئے ملاقات کی اور ان کے سامنے جیراچوری صاحب کے نظریہ اقربت کی بات ہوئی تو مولانا نے فرمایا کہ ”حافظ صاحب ذرا متعدد بھتیجوں کے ساتھ صورت حال پر غور کیجئے“ مجھ پر اس نظریہ کی لغویت اسی وقت واضح ہو گئی۔ اس مسئلہ میں میرے پہلے رہنما مولانا محمد حسن صاحب مرحوم و مغفور ہی تھے۔

مراجع و مصادر

- ۱- قرآن حکیم
- ۲- احکام القرآن . لابی بکر محمد بن عبدالله ابی العریب الاندلسی م ۵۴۲ھ
مطبعة السعادة مصر ۱۳۳۱ھ
- ۳- احکام القرآن . لابی بکر احمد بن علی الرازی الجصاص م ۳۷۰ھ . مطبعة
اوقاف الاسلامیه قسطنطنیہ ۱۳۳۵ھ (بعهد سلطان وحید خان وباهتمام
نظارۃ الاوقاف)
- ۴- فتح القدير . الجامع بین فنی الروایة والدرایة من علم التفسیر --- للامام
محمد بن علی الشوکانی م ۱۲۵۰ھ --- مطبعة مصطفى البابی (مصر)
۱۳۴۹ھ
- ۵- تفسیر المنار . للسید محمد رشیدرضا . مطبعة المنار . مصر الطبعة الثانية
۱۳۶۵ھ
- ۶- تفسیر المراغی . لاحمد مصطفى المراغی . مطبعة مصطفى البابی الحلبي
واولاده بمصر --- الطبعة الاولى ۱۳۶۵ھ . ۱۹۴۶ھ
- ۷- تفسیر ابن کثیر --- حافظ ابن کثیر
- ۸- تفسیر احمدی از ملا جیون مطبوعه مطبع حسنی (مقام وتاریخ طباعت
ندارد)
- ۹- تفسیر ابو الفتوح رازی . از شیخ حسین بن علی الخزاعی المعروف بابی
الفتوح رازی مطبوعه چاپ خانه شرکت تضامنی محمد حسن علمی
وشرکاوہ . تهرآن (ایران) خردادماه ۱۳۲۰ھ
- ۱۰- تفسیر بیان القرآن اردو . مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مطبوعه اشرف المطابع تھان
بھون (انڈیا) سنہ ندارد
- ۱۱- تفسیر حقانی (فتح المنان) . اردو تفسیر از مولانا عبدالمق ولدی شائع کردہ شیخ غلام علی

- ایند سنز الہور ۱۳۶۳ھ
- ۱۲- صحیح البخاری۔ ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری م ۲۵۶ھ۔ مطبوعہ لیدن مطبعتہ بریل ۱۹۰۸ء
- ۱۳- صحیح مسلم۔ ابی الحسین مسلم بن حجاج نیشاپوری، ۲۶۱ھ۔ ناشر محمد صبیح و اولادہ بمبیدان الازھر بمصر ۱۳۳۳ھ
- ۱۴- صحیح الترمذی۔ لابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی م ۲۷۹ھ۔ المطبعة المصرية بمصر ۱۳۵۰ھ موافق ۱۹۳۱ء۔ الطبعة الاولى۔
- ۱۵- موطا۔ الامام مالک بن انس م ۱۷۹ھ۔ داراحیاء الکتب العربیہ۔ عیسیٰ البابی الحلبي و شرکاوه (مصر) ۱۳۷۰ھ۔ ۱۹۵۱ء
- ۱۶- بلوغ المرام۔ للحافظ ابن حجر العسقلانی م ۸۵۲ھ۔۔۔۔۔ مطبع مصطفى محمد صاحب المكتبة التجارية الكبرى مصر سنہ طباعت ندارد۔
- ۱۷- الجامع الصغير للسيوطی۔ مصطفى البابی الحلبي و اولادہ بمصر سنہ ندارد
- ۱۸- الفروع من الجامع الكافي۔ لملامحمد بن يعقوب بن اسحاق الكليني م ۳۲۹ھ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۶ء
- ۱۹- کتاب الام۔ الامام محمد بن ادريس الشافعیؒ المطبعة الكبرى الاميريه۔ بولاق (مصر) ۱۳۲۵ھ
- ۲۰- المحلى۔ لابی محمد بن احمد بن سعید بن حزم الاندلسی م ۳۵۶ھ مطبوعہ۔ ادارة الطباعة المنيرية قاهرة ۱۳۵۷ھ۔ ۱۹۳۸ھ
- ۱۲- بداية المجتهد۔ لابن رشد القرطبي م ۵۹۵ھ۔ مطبعة الاستقامة قاهرة ۱۳۵۷ھ۔ ۱۹۳۸ء
- ۲۲- فيض الباری۔ شرح بخاری للعلامه محمد انور شاه کشمیری م ۱۳۵۲ھ۔ مطبعة دارالمأمون مصر ۱۳۵۷ھ۔ ۱۹۳۸ء الطبعة الاولى
- ۲۳- عینی شرح بخاری۔۔۔۔۔
- ۲۴- مصادر الاحکام الشرعیہ۔ صالح بن غالب الیافعی سلطانہ حیرموت۔۔۔۔۔ مطبع مصطفى البابی الحلبي بمصر۔ ۱۳۶۵ھ۔ ۱۹۳۸ء الطبعة الاولى
- ۲۵- الاحکام فی اصول الاحکام۔ لابن حزم الاندلسی م ۴۵۶ھ۔ مكتبة الخانجي مصر ۱۳۴۵ھ

- ۲۶- اصول التشریح الاسلامی۔ للاستاذ علی حسب اللہ۔ مطبعة العلوم شارع الخلیج بمصر۔ الطبعة الاولى ۱۹۵۲ء
- ۲۷- تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ خضری التشریح الاسلامی کا اردو ترجمہ از عبد الاسلام ندوی۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ (انڈیا) سنہ ندارد
- ۲۸- مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ۔ لابن تیمیہ الحرانی م ۶۲۱ھ۔ مطبع کردستان العلمیہ قاہرہ مصر ۱۳۲۹ھ۔
- ۲۹- الدر المختار۔ لعلاء الدین علی الحسکفی۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۱۶ء
- ۳۰- المقارنات التشریحیة۔ من القوانين الوضعیة المدنیة والتشریح الاسلامی --- للسید عبداللہ علی حسین --- دار احیاء الکتب العربیة۔ عیسی البابی الحلبی مصر الطبعة الاولى ۱۳۶۸ھ۔ ۱۹۴۹ء۔
- ۳۱- الموارث الاسلامیہ۔ فی المذاهب الاربعہ: - ل احمد کامل الخضری شیخ معہد دمیاط الطبعة الثانیہ۔ مطبعة التوکل بمصر ۱۳۶۹ھ۔ ۱۹۵۰ء
- ۳۲- احکام الموارث۔ لمحمد محی الدین عبدالحمید۔ مطبع عیسی البابی مصر ۱۹۴۷ء
- ۳۳- سراجی۔ مع ضیاء السراج (حاشیہ)۔ مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۵ھ مصنف سراج الدین محمد بن محمد سجاوندی م ۶۵۰ھ ہیں۔
- ۳۴- شریفیہ۔ شرح سراجیہ۔ از سید شریف علی۔ مطبع مگشن امر ٹیکو ۱۲۸۹ھ۔ ۱۸۷۲ء
- ۳۵- کتاب الفرائض۔ من شرائع الاسلام للشیخ نجم الدین ابی القاسم المحلی۔ مطبوعہ وکٹوریہ پریس انور ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء
- ۳۶- الوراثہ فی الاسلام۔ للحافظ اسلم الجیراج بوری۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۴ء
- ۳۷- حل المشکلات فی الفرائض۔ شجاع بن نور اللہ انقروی مدرس مدرسہ سرای قتیق اورنگ (ترکی) مطبوعہ بواق ۱۲۸۵ھ۔
- ۳۸- فتاوی عالمگیری۔ اردو ترجمہ از سید امیر علی مرحوم۔ مطبوعہ نو النور ٹیکو ۱۹۳۸ء
- ۳۹- حجت اللہ البالغہ۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی م ۷۷۰ھ کی کتاب کا اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم صاحب پشوری۔ شائع کردہ قومی کتب خانہ انور۔ نہ مطباعت ندارد۔
- ۴۰- جامع الاحکام فی فقہ الاسلام۔ سید امیر علی مرحوم کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ از

- سید ابوالحسن صاحب۔ مطبوعہ نو لکھنؤ (سن طباعت ندارد)
- ۴۱- مختار المسائل۔ اردو ترجمہ از سید سرور حسین صاحب مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۱ء
- ۴۲- فتاویٰ المیراث۔ معروف بہ شرح نظم فرائض۔ اصل از مولوی جعفر علی و شرح از مولوی محمد یوسف علی۔ مطبوعہ نو لکھنؤ ۱۲۹۰ھ - ۱۸۷۳ء
- ۴۳- الوارثت فی القرآن۔ خواجہ احمد الدین امرتسری۔ شائع کردہ دفتر امت مسلمہ امرتسر ۱۹۳۱ء
- ۴۴- تین اہم مسائل۔ شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام کراچی۔ سنہ ندارد
- ۴۵- سیرت عائشہ، سید سلیمان ندوی: داراللمصنفین اعظم گڑھ سنہ ندارد
- ۴۶- الفاروق۔ مولانا شبلی نعمانی۔ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ۔ سنہ ندارد
- ۴۷- اسلام کا اقتصادی نظام حفظ الرحمن سیوہاروی۔ داراللمصنفین دہلی سنہ ندارد
- ۴۸- پوتے کی میراث۔ مفتی محمد شفیع صاحب کا مختصر سا پمفلٹ (تحریر) کردہ جامعہ اشرفیہ۔ نیلا گنبد لاہور (۱۹۵۴ء)
- ۴۹- یتیم پوتے کا حق وراثت۔ سید غلام احمد بی اے پلیڈر منٹگمری کا مختصر سا پمفلٹ جسے خود مصنف نے شائع کیا ہے۔ ۱۹۵۳ء
- ۵۰- متفقہ پنجاہ Legislative Assembly کی اس مسئلہ پر طبع کردہ پبلک آراء یعنی

Opinion on the Punjab Muslim personal law (Shariat) application (Amendment) bill (8th of 1953) and its supplement.

English Books

- 51:- Encyclopedea of Religion and Ethics (Edited by James Hastings) Vol: 7 Article on "Inheritance".
- 52:- Principles of Mohammeden Law by F.D.Mulla 13th Ed (1950) Calcatta
- 53:- Mohammeden Law by F.B Tayabji- 3rd Ed. 1940) Bombay.
- 54:- Muslim Institutions by Maurice Gaudferoy 1st Ed. (1950)

George Allen and Unwin, London.

- 55:- Reconstruction of Religious Thought in Islam by Allama Iqbal (Lahore Editon)
- 56:- Hand Book of Mohammeden law by Syed Amir Ali 3rd Ed. (1911), Calcatta.

اس کے علاوہ :

رسالہ طلوع اسلام کراچی کے ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء کے متعدد پرچوں ---
 رسالہ ترجمان القرآن لاہور کے ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۳ء کے مختلف شماروں اور اخبار اہل
 حدیث امرتسر کے ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کے پرچوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔



سوانحی خاکہ

نام : حافظ احمد یار
 ولدیت : مہر محمد یار
 تاریخ پیدائش : ۵ جنوری ۱۹۲۰ء
 جائے پیدائش : جھنگ ، سرگودھا روڈ پر ، جھنگ سے پانچ میل کے فاصلے پر دریائے چناب کے کنارے واقع گاؤں ”حبیب“۔

تعلیم : ۱۹۳۵ء میں ایم۔ بی ڈل سکول جھنگ سے ورنیکلر کا امتحان پاس کیا۔
 ☆ ۱۹۳۷ء میں اسی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔
 ☆ ۱۹۴۳-۴۵ء گورنمنٹ نارمل سکول گلکھڑ سے بی۔ اے۔ وی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور کلاس میں اول رہے۔ اسی دوران قرآن حکیم حفظ کیا۔
 ☆ ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔
 ☆ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی ہی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس عرصے میں جامعہ محمدی جھنگ کے عالم دین مولانا محمد ذاکر مرحوم سے عربی گرائمر کی تعلیم حاصل کی۔

☆ ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا ، اول آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔
 ☆ ۱۹۵۷ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ یہاں بھی اول رہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

ملازمت : ۱۹۴۹ء-۱۹۵۲ء ، ایم بی ہائی سکول میں بطور استاد کام کیا۔

☆ ۱۹۵۵ء-۱۹۶۴ء اسلامیہ کالج سول لائسنز میں بطور استاد رہے۔

☆ ۱۹۶۴ء-۱۹۸۰ء شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں خدمات سرانجام دیں

☆ ریٹائرمنٹ کے بعد قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج سے وابستہ رہے۔

تصانیف : دستور حیات ، دین و ادب ، یتیم ، یونیورسٹی کے لئے متعدد یونٹ ،

297.34

298 ی



* 5 5 2 9 0 - 11 - 6 7 *



9 789695 031292

ناشران و تہران کتب
 الفیصل
 اردو بازار لاہور

یاد آتی ہے (جسے ہم نے مقالہ کے شروع۔۔۔ مقدمہ اور تمہید۔ میں بھی بیان کیا ہے) کہ ”انہ اول علم یبزغ من امتی“ (یعنی علم سب سے پہلے میری امت سے اٹھایا جائے گا)۔۔۔ بہر حال اگر کسی آدمی کو یہ آراء (جن کا پورا سرکاری نام مقالہ کے آخر پر کتابیات میں دیا گیا ہے) مل سکیں تو ہم مولانا مسلم تیرانچوری صاحب کے مقالہ ”عجیب الارث‘ اور سید غلام احمد رضوی کے کتابچے ”تتیم پوتے کا حق وراثت“ کے ساتھ ان پبلک آراء (Opinions) کے مطالعہ کو بھی نفس موضوع پر مزید مطالعہ (For Further reading) کے طور پر پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں۔

☆ ہمارا خیال ہے کہ کسی متنازعہ اور مختلف فیہ مسئلہ پر محض یک طرفہ مطالعہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ موافق اور مخالف دونوں قسم کا لٹریچر پڑھنا چاہئے۔
لیہاک من هلك عن بینة ویحی من حی عن بینة وان الله لسمیع علیم
(الانفال: ۲۷)

” تاکہ جو ہلاک ہو تو دلیل سے (اتمام حجت کے بعد) ہلاک ہو اور جو جے تو دلیل سے (حق پہچان کر) ہے اور اللہ تعالیٰ ضرور سب چیزیں جانتا ہے اور سب کچھ جانتے والا ہے۔“

اگر صاف نیت اور طلب حق کے ارادے سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ ہدایت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

☆ بہر حال چیمہ صاحب کا یہ ترتیبی بل اسمبلی سے نہ منظور ہوا اور نہ ہی نا منظور یعنی یہ پہلا ٹیسٹ غیر فیصلہ کن (Draw) رہا فریقین کی تیاریاں، سہری رہ گئیں اور معاملے کو التواء میں ڈال کر رفع و دفع کر دیا گیا۔ اس التواء اور رفع و دفع کرنے کے اسباب و عوامل کیا تھے یہ ایک راز ہی رہا غالباً اس زمانے کے ارکان پنجاب اسمبلی اس کی وجوہ سے واقف ہوں گے۔ اس بل کے پنجاب اسمبلی میں پیش ہونے سے ”تتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ“ ارباب سیاست کے ایک نیا

وَأَنْ تَقُومُوا لِلَّيْلِ بِإِغْتِسَابٍ

تیموتے کی ایشیا کلمہ

ایسی اور فقیہانہ



حافظ احمد یار